Phone : 80800

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اپریل 1964

حدیث کے پرکھنے کا معیار

(۱) سنیوں کے نزدیک

مسند احمدؒ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا۔

تکثر لکم الاحادیث بعدی فما روی لکم حدیث عنی فاعرضوہ علی کتاب اللہ۔
فما وافقہ فاقبلوہ و ما خالفہ فردوہ۔

میرے بعد تم سے بڑی کثرت سے حدیثیں بیان کی جائینگی۔ لہذا میری کوئی حدیث تم سے روایت کی جائے تو اسے کتاب اللہ (قرآن) کے سامنے پیش کرو۔ پھر جو اس کے مطابق ہو اسے قبول کرو۔ اور جو اس کے خلاف ہو اسے رد کردو۔

(۲) شیعوں کے نزدیک

روی عنھم علیھم السلام ما اتکم منا فاعرضوہ علی کتاب اللہ۔ فما وافق کتاب اللہ فخذوہ و ما خالفہ فاطرحوہ۔ (استبصار ۔ جلد ۲ ۔ صفحہ ۱۵۸ ۔ بحوالہ ثقافت)

ائمہ سے مروی ہے کہ ہماری طرف سے تمہارے پاس جو کچھ بھی آئے اسے کتاب اللہ (قرآن) کے سامنے پیش کرو۔ پھر جو کچھ کتاب اللہ کے مطابق ہو اسے لے لو۔ اور جو کچھ اس کے خلاف ہو اسے پھینک دو۔

طلوعِ اسلام

احادیث کے پرکھنے کے لئے طلوعِ اسلام کا یہی مسلک ہے۔

شائع کردہ: ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت: ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدلِ اشتراک
پاک و ہند سے سالانہ — دس روپے
غیر ممالک سے سالانہ — ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ
پاک و ہند سے
ایک روپیہ

ٹیلیفون نمبر (۸۰۸۰۰)
خط و کتابت کا پتہ
ناظم طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

جلد ۱۷ — اپریل ۱۹۶۴ء — نمبر ۴

فہرستِ مضامین

۱۔ لمعات — ۲
۲۔ روایات کا قرآن — (علامہ سید احمد السیفی، ترجمہ سید نصیر شاہ صاحب) — ۹
۳۔ باب المراسلات — (۱) مسلمانوں کے "حرم" (۲) یادگاریں (۳) شریف زادیوں سے چھیڑ چھاڑ (۴) ایک آیت کا صحیح مطلب (۵) مسلم اور مومن میں فرق۔ — ۳۳
۴۔ حقائق و عبر — (۱) حرم کعبہ میں امن (۲) علمائے ازہر (۳) نبوت کیسے ملتی ہے (۴) مرغے سے یہ کچھ سیکھو (۵) تیری آواز مکے اور مدینے (۶) جنابِ یار — ۴۵
۵۔ مجلسِ اقبالؒ — ۵۱
۶۔ انقلابِ عظیم — (محترم محمد اسلام صاحب کراچی) — ۶۱
۷۔ نقد و نظر — (۱) ماہنامہ فکر و نظر (۲) انڈونیشیا (۳) سرسید اور اصلاحِ معاشرہ — ۶۵
۸۔ رابطہ باہمی — (طلوعِ اسلام کنونشن) — ۷۶
۹۔ بچوں کا صفحہ — ۷۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

تشکیل پاکستان کے بعد سے، جس شدت اور تکرار سے "اسلام" کا لفظ دہرایا گیا ہے کسی اور لفظ کے حصے میں یہ بات نہیں آئی۔ اٹھتے بیٹھتے۔ چلتے پھرتے۔ لکھتے بولتے، ہر گوشے سے اسلام۔ اسلام۔ اسلام کے الفاظ فضا میں گونجتے چلے جا رہے ہیں۔ ہر واعظ کی زبان پر یہ الفاظ رہتے ہیں۔ ہر لیڈر کے بیان میں یہ التزاماً نظر آتے رہیں۔ اسلامی اقدار۔ اسلامی طرز زندگی۔ اسلامی اخلاق۔ اسلامی نظام۔ اسلامی سیرت۔ اسلامی کردار ــ اور نہ معلوم کیا کیا اسلامی! لیکن ان الفاظ کے اس تکرار و اصرار سے دھرانے کے باوجود، کسی کے ذہن میں متعین طور پر ان کا مفہوم نہیں ملے گا۔ مذہبی حلقہ، جو ان الفاظ کا اجارہ دار ہے، زیادہ سے زیادہ اتنا بتائے گا کہ اسلام سے مقصود ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ــ یا یہ کہ چور کے ہاتھ کاٹنے چاہئیں۔ زانی کو سنگسار کرنا چاہیئے۔ شراب، جوا۔ ریس بند کر دینا چاہیئے۔ عورتوں کو برقعہ کے بغیر باہر نہیں نکلنا چاہیئے۔ اگر یہ کچھ ہو جائے تو اسلام کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ اپنی جگہ پر بالکل بجا اور درست۔ اور جرائم کی سزا بھی ضروری۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسلام سے مقصود فقط اتنا ہی ہے۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ ہندوستان کے مسلمان بھی ادا کرتے ہیں اور جرائم کی شرعی سزائیں سعودی عرب میں رائج ہیں۔ کیا یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہاں اسلام کا مقصد پورا ہو رہا ہے؛ اگر وہاں اسلام کا مقصد پورا ہو رہا ہے تو کیا یہی ہے وہ اسلام جس کے متعلق ہم دنیا کو بتاتے ہیں (اور اس پر ہمارا ایمان ہے) کہ اسلام، نوع انسانی کی مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہ خدا کی طرف سے تجویز کردہ واحد مکمل اور آخری نظام حیات ہے۔ اور ساری دنیا کے انسان مل کر بھی اس کی کسی ایک شق کی مثل اور نظیر وضع اور مرتب نہیں کر سکتے۔ ہم اپنی جگہ کچھ ہی کیوں نہ سمجھ لیں لیکن اس اسلام کو پیش کر کے، جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ ہم دنیا سے اپنے دعوے کی صداقت نہیں منوا سکتے۔

اسلام نام ہے ان قوانین کا جن کے مطابق اس عظیم کارگہ کائنات کا نظام اس حسن و خوبی سے چل رہا ہے۔ قرآن کریم میں ہے اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳/۸۳) کیا یہ لوگ اس نظام زندگی کے علاوہ جو خدا نے ان کے لئے تجویز کیا ہے کوئی اور نظام اپنے لئے چاہتے ہیں۔ حالانکہ کائنات میں جو کچھ ہے سب اس کے قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہے۔ اسی نظام کا نام اسلام ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۳/۸۵) جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی اور نظام زندگی اختیار کرنا چاہے گا تو عدالتِ خداوندی میں وہ قابلِ قبول نہیں ہوگا اور وہ دیکھ لے گا کہ آخر الامر وہ کس طرح نقصان میں رہتا اور تباہ ہو جاتا ہے۔ یہ نظامِ زندگی جس طرح ایک فرد کو وہ کچھ بنا دیتا ہے جو کچھ بن سکنے کا آخری امکان ایک انسان کے لئے ہے، اسی طرح قوموں کی موت اور زندگی کے فیصلے بھی اسی کے مطابق ہوتے ہیں۔ جو قوم اس نظام کے مطابق چلتی ہے وہ زندہ رہتی ہے۔ جو اسے چھوڑ کر اپنے لئے کوئی اور راستہ تجویز کر لیتی ہے وہ تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم نے اس باب میں نہایت واضح اصول و قوانین دیئے ہیں۔ جو قوم اس حقیقتِ کبریٰ پر ایمان رکھتی ہے کہ ہماری موت اور حیات کا فیصلہ انہی کے مطابق ہوتا ہے اور اسکے بعد ان کے مطابق اپنا نظام وضع کرتی ہے وہ مسلم کہلاتی ہے جو ان کے خلاف چلتی ہے وہ تباہ و برباد ہو جاتی ہے، خواہ وہ زبان سے لاکھ بار بھی اسلام اسلام کیوں نہ پکارتی رہے۔ اس نے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ ہم نے یہ ضابطہ قوانین بھیجا ہی اس لئے ہے۔ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ (۸/۴۲) جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل اور برہان کی رُو سے زندہ رہے اور جس نے تباہ ہونا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے تباہ ہو۔ ہمارے ہاں دھاندلی نہیں کہ جسے چاہا یونہی زندگی کی حیات افروز خوشگواریوں سے سرفراز کر دیا اور جسے چاہا یوں ہی خاسر و نامراد بنا دیا اور تباہ و برباد کر دیا۔

ہم نے جو اوپر کہا ہے کہ جو قوم ان قوانین کی صداقت پر یقین رکھتی ہے، اسے مسلم کہتے ہیں۔ اور جو ان سے انکار کرتی ہے، وہ کافر کہلاتی ہے تو اس سے یہ مطلب نہیں کہ جو قوم ان قوانین کی صداقت سے انکار کرتی ہے، وہ ان قوانین کے دائرے سے باہر چلی جاتی ہے اور اس پر ان کا کوئی اختیار و اقتدار نہیں رہتا۔ یہ بات نہیں۔ یہ قوانین اپنی نتیجہ خیزی میں اٹل ہیں اور اس کے محتاج نہیں کہ کوئی انہیں مانتا ہے یا نہیں مانتا۔ کوئی انہیں مانے یا نہ مانے۔ ان کا اطلاق ہر ایک پر یکساں ہوتا ہے۔ اگر ایک شخص یہ نہیں مانتا کہ سنکھیا ہلاکت خیز ہوتا ہے اور سنکھیا کھا لیتا ہے تو سنکھیا اپنا اثر اس پر بھی اسی طرح کرے گا جس طرح اس شخص پر جو یہ جانتے اور مانتے ہوئے (کہ سنکھیا مہلک ہے) سنکھیا کھا لیتا ہے۔ سنکھیا کو ہلاکت آفریں ماننے سے مقصد یہ ہے کہ انسان اس سے پرہیز کرے۔ اسے کھا نہ لے۔ لہٰذا اگر کوئی قوم ان قوانین کی صداقت پر یقین نہیں رکھتی جن کی

رُو سے قوموں کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ وہ ان کے خلاف چلے گی۔ اور اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ اس زمرہ میں وہ قوم بھی شامل ہے جو زبان سے ان قوانین کی صداقت کا اقرار کرتی ہے۔ اور دل سے انہیں تسلیم نہیں کرتی یا تسلیم کرتی ہے اور ان کے مطابق عمل نہیں کرتی۔ خدا کے قوانین اپنی نتیجہ خیزی میں اٹل ہوتے ہیں۔ یہاں تو کیفیت یہ ہے کہ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ — حق اور باطل کی کشمکش ہر وقت جاری ہے۔ تخریبی نتائج پیدا کرنے والی قوتیں ہر وقت ان قوتوں کے ساتھ برد آزما رہتی ہیں جو تعمیری نتائج پیدا کرتی ہیں۔ فَيَدْمَغُهُ۔ اور تعمیری قوتیں آخرالامر تخریبی قوتوں کا سر توڑ دیتی ہیں۔ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱/۱۸) اور موخرالذکر قوتیں میدان چھوڑ کر بھاگ جاتی ہیں۔ اسے قوم کی زندگی کہا جاتا ہے یعنی جس قوم کا نظام انسانیت ساز تعمیری نتائج پیدا کرے وہ زندہ رہتی ہے۔ جس کے ہاں تخریبی قوتیں غالب رہیں وہ تباہ اور برباد ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اس نے پورے حتم و یقین کے ساتھ اعلان کر دیا کہ وَلَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا۔ (۴/۱۴۱)۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ قوم جو حق کے تعمیری پروگرام پر یقین رکھے اور اس کے مطابق عمل کرے اس قوم سے مغلوب ہو جائے جو باطل کے تخریبی پروگرام کو کامیابی کا ذریعہ سمجھے

حق اور باطل۔ یا تعمیری اور تخریبی پروگرام کی تفاصیل، قرآن کریم کے اوراق پر درخشندہ ستاروں کی طرح جگمگاتی نظر آتی ہیں۔ سب سے پہلے وہ بتاتا ہے کہ جس قوم کا نظام، عدل کی بجائے ظلم پر مبنی ہو وہ قوم کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ اور ظلم کے معنی ہیں کسی شے کا اس مقام پر نہ ہونا جہاں اسے ہونا چاہیئے۔ وہ کہتا ہے وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّأَنْشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِيْنَ۔ کتنی ہی قومیں ایسی گزری ہیں کہ ہمارے قانون مکافات نے انہیں۔ ان کے ظلم کی وجہ سے تباہ کر دیا اور ان کی جگہ اور قوموں کو لے لی۔ چنانچہ ان کے ساتھ ہوا یہ کہ فَلَمَّا أَحَسُّوْا بَأْسَنَا إِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ۔ جب انہوں نے اپنی تباہی کو محسوس طور پر اپنے سامنے دیکھا تو وہ اس سے بھاگنے لگے۔ لیکن ہمارے قانون مکافات نے انہیں آواز دی کہ لَا تَرْكُضُوْا۔ مت بھاگو۔ تم اب بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ وَارْجِعُوْا إِلٰى مَا أُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسَاكِنِكُمْ۔ لوٹو، اور پلٹ کر وہیں چلو جہاں تم نے اپنے عیش و عشرت کے سامان جمع کر رکھے اور غریبوں کی محنت کی کمائی سے اپنے لئے بڑے بڑے ذی شان محلات تعمیر کر رکھے تھے۔ چلو لوٹ کر وہیں چلو لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُوْنَ (۲۱/۱۳) تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ تم نے یہ چیزیں دوسروں کی کمائی سے کیسے بنالیں۔ تمہیں اس کا کیسے حق پہنچتا تھا قَالُوْا يٰوَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ۔ اس کے جواب میں انہوں نے بزبان حال کہا کہ ہم واقعی ظلم کیا کرتے تھے اور یہ تباہی اسی وجہ سے آئی ہے۔ فَمَا زَالَتْ تِلْكَ دَعْوٰهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ۔

لیکن اس وقت ان کے اس اعتراف و اقرار نے انہیں کچھ فائدہ نہ دیا۔ وہ یہ کہتے رہے اور ہمارا قانونِ مجازات انہیں تباہ و برباد کے چلا گیا۔ حتیٰ کہ وہ ایسے ہو گئے جیسے کٹا ہوا کھیت یا بجھا ہوا الگاؤ جس میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہ رہے۔ اس کے بعد قرآن کریم ایک عظیم حقیقت کیطرف توجہ مبذول کراتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ یہ کچھ یوں ہی اتفاقی طور پر نہیں ہوا۔ یہ ہمارے اس قانونِ مکافات کی رُو سے ہوا جسے نتیجہ خیز بنانے کے لئے یہ سارا سلسلۂ کائنات معروفِ گردش ہے۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (۲۱/۱۶) ارض و سماء کا یہ محیر العقول سلسلہ ہم نے یونہی کھیل تماشے کے طور پر نہیں بنایا۔ یہ ایک خاص مقصد کے لئے معروفِ تگ و تاز ہے۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ کسی فرد یا قوم کا کوئی عمل اپنا نتیجہ مرتب کئے بغیر نہ رہے۔

قرآن کریم نے استبدال و استخلافِ قوم کا پہلا اصول یہ بتایا ہے کہ جس قوم کا نظام، عدل کی بجائے ظلم پر مبنی ہو وہ قوم کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس نے دوسرا اصول یہ بتایا کہ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ۔ سن رکھو کہ تم وہ لوگ ہو کہ تم سے کہا جاتا ہے کہ تم اپنا نظام ایسا رکھو جس میں تمہاری محنت کا ماحصل نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے کھلا ہے لیکن تم میں ایسی ذہنیت والے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں جو سب کچھ سمیٹ کر اپنے لئے رکھنا چاہتے ہیں یاد رکھو۔ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ۔ جو شخص دوسروں کو زندگی کی خوشگوار یوں سے محروم رکھتا ہے وہ درحقیقت خود اپنے آپ کو سعادتوں اور کامرانیوں سے محروم رکھتا ہے۔ اس سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑتا اس لئے کہ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اللہ تمہارا محتاج نہیں۔ تم اس کے محتاج ہو۔ بہرحال۔ اسے اچھی طرح سن رکھو کہ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ۔ اگر تم نے حق کے نظام سے منہ موڑ کر غلط روش اختیار کر لی تو وہ تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا۔ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸)۔ اور وہ قوم تمہارے جیسی نہیں ہو گی۔

یہ ہے قوموں کی موت اور حیات متعین کرنے والا دوسرا اصول۔ یعنی جس قوم کا نظامِ زندگی یہ ہے کہ دولت اور پیداوار تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کھلی رہے وہ قوم زندہ رہے گی۔ جس میں کچھ لوگ یہ تمام چیزیں سمیٹتے چلے جائیں، وہ قوم باقی نہیں رہتی۔ اس کی جگہ ایسی قوم لے لیتی ہے جس کا نظام اس قسم کا نہیں ہوتا۔

قرآن کریم نے اس سلسلہ میں تیسرا اصول یہ بتایا کہ جو قوم محض باتیں بنانے میں مصروف اور زندگی کے SERIOUS مسائل سے پنجہ گیر ہونے کے بجائے محض) تفریحات میں مشغول رہے وہ بھی باقی نہیں رہ سکتی۔ سورہ معارج میں ہے لَقٰدِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ۔

ہم اس پر قادر ہیں کہ (اس قوم مخاطب کی جگہ) ایک ایسی قوم لے آئیں جو ان سے بہتر ہو۔ یہ ہمیں ایسا کرنے سے روک نہیں سکتے۔ فَذَرْهُمْ يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوعَدُونَ۔ (۴۳/۸۳) سو تو انہیں باتیں بنانے اور کھیل تماشے میں وقت ضائع کرنے میں مصروف رہنے دے تاآنکہ وہ روزِ بد ان کے سامنے آجائے جس کے متعلق ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ آکر رہے گا۔

یہ تیسرا اصول ہے اس کے بعد اس نے چوتھا اصول یہ بیان فرمایا ہے کہ زندگی مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔ مسلسل جدوجہد۔ پیہم سعی و عمل۔ غیر منقطع تگ و تاز۔ ان تھک کوشش۔ اس کا نام ہے زندگی۔

گردشِ پیہم سے پختہ تر ہے جامِ زندگی ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

جو قوم جس سانس میں جدوجہد (جہادِ زندگی) سے جی چراتی ہے اسی سانس میں اس پر موت طاری ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ موت درحقیقت نام ہی جدوجہد ترک کر دینے کا ہے۔

مگر کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

اسی لئے قرآن کریم نے جماعتِ مومنین سے بطور تنبیہ کہا کہ مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ ـــــ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں باہر نکلو تو تمہارے پاؤں بوجھل ہو کر زمین گیر ہو جاتے ہیں۔ أَرَضِيتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ۔ کیا تم مستقل اور بلند اقدار کے مقابلے میں طبعی زندگی کی جاذبیتوں کو ترجیح دیتے ہو۔ اگر ایسا ہے تو سے اچھی طرح سمجھ رکھو کہ طبعی زندگی کی خوشگواریاں بُری چیز نہیں لیکن جب ان میں اور مستقل اقدارِ حیات میں ٹکراؤ ہو تو فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ـــــ طبعی زندگی کا ساز و سامان مستقل اقدارِ حیات کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔ إِلَّا تَنْفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا۔ اگر تم نے جہادِ زندگی سے منہ چرایا تو یاد رکھو تم پر سخت تباہی آجائے گی۔ وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ اور خدا کا قانونِ مکافات تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا۔ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا۔ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ (۹/۳۸-۳۹) اور تم خدا کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکو گے۔ اللہ کا قانون نافذ العمل ہو کر رہتا ہے۔ اس پر پوری پوری قدرت حاصل ہے۔ کارگہِ فطرت میں ہر شے کے پیمانے مقرر ہیں اور سب کچھ ان پیمانوں کے مطابق ہوتا ہے۔

یہ ہے قوموں کی موت و حیات کے لئے چوتھا قانون۔ اس کے بعد اس نے وراثتِ ارض کا الٰہیا جامع اصول بیان فرمایا ہے جس میں یہ تمام تفاصیل سمٹ کر آجاتی ہیں۔ سورہ انبیاء میں ہے وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ۔ ہم نے ہر آسمانی صحیفہ میں ضروری قوانین اور تاریخی یادداشتیں درج کرنے کے بعد

اس اصل الاصول کو محکم طور پر بیان کر دیا تھا کہ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُوْنَ۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ زمین کے وارث وہی لوگ ہو سکتے ہیں اور انہیں کے قبضہ میں یہ رہ سکتی ہے جن میں اس کے لئے ضروری صلاحیت موجود ہو۔ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ـــــ (۲۱/۱۰۶)۔ یہ قانون ایسا ہے جس میں ہر اُس قوم کے لئے جو اپنی زندگی نظامِ خداوندی کے تابع رکھنا چاہے ایک بڑی دور رس حقیقت پوشیدہ ہے۔ جہاں تک صلاحیت کا تعلق ہے عام طور پر اس میں طبیعی (PHYSICAL) اور ذہنی (INTELLECTUAL) صلاحیتوں کا شمار ہوتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے اس کی وضاحت کر دی ہے کہ یہ صلاحیتیں بے شک ضروری اور لاینفک ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ ایک اور صلاحیت بھی ہے جو اصلی اور بنیادی ہے اور یہ ہے انسانی ذات کی صلاحیت جو حسن سیرت اور بلندیٔ کردار کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ یہ پیدا ہوتی ہے مستقل اقدار پر ایمان اور ان کے مطابق عمل کرنے سے۔ اسی لئے قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ خدا نے وعدہ کر رکھا ہے کہ "ایمان و اعمالِ صالحہ کا فطری نتیجہ استخلاف فی الارض" ہے۔ اس کے برعکس جو قوم اس راستے سے ہٹ کر دوسری راہیں اختیار کر لیتی ہے وہ تباہی اور بربادی کے جہنم میں جا گرتی ہے۔ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ـــــ (۴۶/۳۵)۔ اسے اچھی طرح سمجھ رکھو کہ اس قوم کے علاوہ جو صحیح رستے کو چھوڑ کر غلط راہوں پر چل نکلے کوئی اور قوم تباہ ہوتی ہی نہیں ــ "صحیح راہ" اور "غلط راہ" کیا ہے؟ اسے اس نے اور واضح الفاظ میں یوں بتا دیا کہ یاد رکھو! مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (۱۳/۱۷)۔ اسی نظام میں باقی رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے جو تمام نوعِ انسان کی نفع رسانی کا موجب ہو۔ کسی خاص خاندان، گروہ، پارٹی، جماعت یا قوم کی منفعت کے لئے نہ ہو۔ یہ ہے کسی قوم کی بقا کا اصل الاصول۔

یہ ہیں ان اصولوں میں سے چند ایک جنہیں قرآن کریم نے قوموں کے عروج و زوال کا ابدی معیار، اور ان کی موت و حیات کا مستقل مدار قرار دیا ہے۔ جب کوئی قوم ان اصولوں کی صداقت کو اپنے دل کی گہرائیوں میں اتار لیتی ہے تو اس سے اس کے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے جس سے اس کی نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے، اور نگاہ کا زاویہ بدلنے سے خارجی اقدار بدل جاتی ہے۔

قوموں کی موت و حیات کا راز اسی نفسیاتی تبدیلی کے اندر ہے۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱) خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنے اندر تبدیلی نہیں پیدا کرتی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

اے کہ منزل راہمی دانی ز راہ — قیمتِ ہر شے ز اندازِ نگاہ

نوع دیگر بیں، جہاں دیگر شود ایں زمین و آسمان دیگر شود

ایمان کے معنی اس نفسیاتی تبدیلی کے ہیں۔ اور اس کے محسوس مظاہر کو اعمالِ صالحہ کہا جاتا ہے۔ اس روش کا نام ہے اسلام۔ یعنی خدا کی مقرر کردہ مستقل اقدار کے مطابق اپنے اندر ایسی تبدیلی پیدا کر لینا جس سے انسان سے ـــــ ایسے اعمال سرزد ہوں جن سے خود اس کی اپنی ذات کی نشو و نما ہوتی جائے اور عالمِ انسانیت کے بگڑے ہوئے کام سنور جائیں۔

ہم نے گزشتہ صفحات میں اسلام کے ان چند اصولوں کے متعلق گفتگو کی ہے جن کا تعلق قوموں کی موت اور حیات سے ہے۔ (قرآن کریم اسی قسم کے اصول و ضوابط زندگی کے ہر انفرادی اور اجتماعی گوشے کے متعلق عطا کرتا ہے)۔

اب ظاہر ہے کہ جو قوم اسلامی زندگی کا اقرار و اعلان کرتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کا اعتراف کرتی ہے کہ اسے ان اصولوں کی صداقت اور محکمیت پر ایمان ہے اور اسے تسلیم ہے کہ اگر ہم ان اصولوں کے مطابق چلیں گے تو ہمیں استحکام اور عروج حاصل ہو جائے گا۔ اور اگر ان کی خلاف ورزی کریں گے تو تباہ اور برباد ہو جائیں گے۔ اس کلیہ سے اگلی بات بالکل واضح ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ اگر کوئی قوم اس اقرار و اعتراف کے باوجود اپنے نظام میں ان اصولوں کے مطابق تبدیلی نہیں کرتی تو وہ تباہی اور بربادی سے بچنا چاہتی ہی نہیں اور جو قوم تباہی سے بچنا ہی نہ چاہے اسے تباہی سے بچا کون سکتا ہے؟ قرآن کریم نے اسی لئے شروع ہی میں اعلان کر دیا ہے کہ وہ ھدی للمتقین ہے۔ یعنی ان لوگوں کے لئے راہنمائی کا ضابطہ جو زندگی کے پُرخطر راستوں اور ان کی وجہ سے آنے والی تباہیوں سے بچنا چاہتے ہیں۔ اسے پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ قوموں کی حفاظت کے لئے مادی اسباب و ذرائع لاینفک ہیں، اور ان کے لئے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، زرعی، صنعتی، معاشیاتی اور دفاعی ترقی اشد ضروری۔ لیکن اس تمام سعی و کاوش کے باوجود، قوموں کی حقیقی فلاح و بہبود اور تباہی و بربادی سے ان کی حفاظت و صیانت کا راز ان اصولوں کے اتباع میں ہے جنہیں قرآن کریم نے اٹل قوانین قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اقوامِ سابقہ کی سرگزشتوں کو بار بار سامنے لا کر کہتا ہے کہ ان کے احوال و کوائف پر غور کرو۔ کانوا اشد منکم قوۃ واکثر اموالا واولادا۔ وہ تم سے قوت و اقتدار اور مال و دولت میں کہیں زیادہ تھے۔ اور ان کا جتھہ بھی بڑا تھا۔ لیکن انہوں نے چونکہ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کی اس لئے تباہ و برباد ہو گئیں۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تمہارا بھی انجام ایسا ہی ہوگا۔ اس لئے کہ لن تجد لسنت اللہ تبدیلا ولن تجد لسنت اللہ تحویلا۔ (۳۵/۴۳)۔ خدا کے یہ قوانین اٹل ہیں۔ نہ ان میں تغیر و تبدل ہوتا ہے نہ ہی ان کا رخ کسی اور سمت کی طرف مڑتا ہے۔ یہ اپنا نتیجہ مرتب کر کے رہتے ہیں۔

یہ ہے اسلام کی پکار زمانے کے لئے۔ فھل من مدکر۔ کیا کوئی ہے جو اس پکار سے عبرت پکڑے اور نصیحت حاصل کرے؟

روایات کا قرآن

(پہلی قسط)

علامہ البہنسی السبیفی (مصری)

ترجمہ سید نصیر شاہ صاحب (میانوالی)

خدائے قدوس کا ارشاد ہے۔

یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ۔

اے رسول! جو کچھ آپ پر نازل کیا گیا ہے پہنچا دیجئے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو فریضۂ رسالت ادا نہ کیا۔

یہ اس کتاب کی آیت مقدسہ ہے جس کا ایک ایک حرف منجانب اللہ ہے اور اگر کوئی محروم القسمت انسان یہ کہہ دے کہ جناب رسالتمآب صلعم نے اللہ کے اس ارشاد گرامی پر عمل نہیں کیا تو کون ہے جو اس کے کفر میں شک کر سکے! حضور سرور کائنات صلعم قیامت تک کے لئے رسول ہیں ان کے بعد کوئی شخص ایسا نہیں آ سکتا جس پر آفتاب درخشاں کی پاکیزہ کرنوں کے ساتھ خدائے قدوس کی وحی نازل ہو اور پھر تاجدار مدینہ کوئی ایسے نبی نہیں تھے کہ ان کی نبوت دریاؤں اور پہاڑوں کے بے معنی خطوط میں محصور ہو۔ وہ کسی خاص وطن کے لئے اور کسی خاص قوم کے لئے مبعوث نہیں ہوئے تھے۔ وہ نہ بنی اسرائیل کی گم گشتہ بھیڑوں کو اکٹھا کرنے آئے تھے اور نہ ان کی زبان صداقت ترجمان یہ اعلان کرتی تھی کہ "میں بچوں کی روٹی کتوں کے آگے نہیں ڈالوں گا۔" ریگزار عرب کے اس دُرِّ یتیم کے لبہائے لعلیں پر تو یہ مقدس فقرہ تھرکتا تھا کہ

یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا ؁

اے افراد نسل انسانی! میں تم تمام کی طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

پھر تبلیغ رسالت کا اہم فریضہ ایسا نہ تھا کہ قرآن چند صحابہؓ کو یاد کرا دیا جاتا اور سبکدوشی حاصل ہو جاتی بلکہ یہ فریضہ تو اس امر عظیم کا متقاضی تھا کہ اس کتاب ہدایت کو محفوظ و مصئون شکل میں نسل انسانی کے حوالہ کیا جاتا تا کہ وفات کے ساتھ حضورؐ کی رسالت

منقطع نہ ہو اور روشنی کا یہ عظیم الشان مینار کارگہِ حیات کی اندھیری پگڈنڈیوں پر اپنا نور بکھیرتا رہے اور یہ جبھی ہو سکتا تھا کہ آپ قرآن کو کتابی شکل میں امت کے حوالے کرتے۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا۔ اس موضوع پر ہم نے پچھلے باب میں تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے[1] اور اپنے اس دعویٰ کو قرآن کی آیاتِ بینات اور قرآن سے مطابقت کرنے والی تاریخی روایات سے بھی ثابت کر دیا ہے۔ متذکرہ مضمون کے آخر میں ہم نے وعدہ کیا تھا کہ روایات کو سامنے رکھ کر قرآن کے متعلق جو تصور پیدا ہوتا ہے ہم اسے "روایات کا قرآن" کے عنوان میں بیان کریں گے۔ پس یہ باب اسی وعدہ کے ایفاء پر محمول کیجئے۔ اور دیکھئے کہ "ہمارا قرآن" کیسا ہے اور "روایات کا قرآن" کس طرح کا ہے؟ اس سلسلہ میں ہم مختلف عنوانات کے تحت روایات یکجا کریں گے۔ اور پھر ان پر تنقید بھی کرتے جائیں گے تاکہ کہیں کوئی سادہ لوح بھائی انہی روایات کو حقیقی تاریخ سمجھ کر قرآن سے بدگمان نہ ہو بیٹھے۔ یہ امر بظاہر بڑا تعجب انگیز نظر آتا ہے کہ مسلمانوں کی کتب روایات اسلام کی بنیادی کتاب، قرآن حکیم کو کیونکر غلط رنگ میں پیش کریں گی مگر بہرحال یہ حقیقت ہے۔ ایسا کچھ کیوں ہوا؟ یہ میرا موضوع نہیں۔ "ایسا ہوا ہے" میں یہی دکھانا چاہتا ہوں۔ میں یہ الفاظ لکھ رہا ہوں اور فرطِ ندامت سے میری پیشانی عرق آلود ہو رہی ہے۔ میرا سر جھک گیا ہے اور میرا قلم ہوا کی زد میں آئے ہوئے چراغ کی لو کی طرح انگلیوں کی گرفت میں لرز رہا ہے۔

اب آئیے۔ "روایات کا قرآن"[2] دیکھئے اور پھر سوچئے کہ یہ روایات معاندینِ اسلام کو کیسا زہریلا مواد فراہم کر رہی ہیں۔ یہاں آپ دیکھیں گے کہ جو امور ہم نے قرآن حکیم سے ثابت کئے تھے اور جن حقائق کا غیر مسلم محققین بھی اعتراف کر چکے ہیں۔ ہماری روایات ان کی حرفاً حرفاً تردید کرتی ہیں۔

عہدِ رسالت میں قرآن جمع نہیں ہوا تھا (معاذ اللہ)

ہم نے قرآن حکیم اور اس کی مطابقت کرنے والی روایات سے ثابت کیا تھا کہ قرآن عہدِ رسالت میں کتابی شکل میں جمع کر دیا گیا تھا اور یہی مصاحف تقریباً ہر گھر میں موجود تھے لیکن "روایات کا قرآن" عہدِ رسالت میں جمع نہیں ہوا تھا۔ الدیرعاقولی لکھتے ہیں۔

"ابراہیم بن بشار، سفیان بن عُیینہ، زہری اور عبید کے واسطوں سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت زیدؓ بن ثابت فرماتے تھے نبی صلعم اس دارِ فانی سے انتقال فرما گئے۔ اور اس وقت تک قرآن کسی چیز میں جمع نہیں ہوا تھا۔" (کتاب الفوائد۔ الاتقان ج اول۔ فتح الباری)

خطابی کا عذر جیسا کہ ہم مضمون کی ابتداء میں لکھ چکے ہیں بحکم "بلّغ ما انزل الیک" حضور سرورِ کائنات پر یہ فریضہ عائد ہوتا تھا

[1] یہ مضمون طلوعِ اسلام بابت اپریل سنہ ۶۳ء شائع ہو چکا ہے۔

[2] بخوفِ طوالت عربی عبارات حذف کر دی گئی ہیں۔ صرف ترجمہ پر اکتفا کیا گیا ہے۔ حوالجات موجود ہیں جسے تصدیق کی ضرورت ہو اصل کتاب دیکھ لے (مترجم)۔

کہ قرآن کتابی شکل میں امت کے حوالے کر جاتے۔ مگر اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ (نعوذ باللہ) حضورؐ نے قرآن جمع نہیں کرایا اور فریضۂ رسالت ادا کرنے میں کوتاہی کی۔ آخر ایسا کیوں ہوا۔ اس کا جواب: بھی طرفگی کا دلچسپ نمونہ ہے۔ خطابی کہتا ہے۔

"رسولِ خدا صلعم نے قرآن کو مصحف میں اس لئے جمع نہیں کرایا کہ آپ کو اس کے بعض احکام یا تلاوت میں نسخ کرنے والے احکام کا انتظار رہتا۔ مگر جب آپ وفات پا گئے تو اللہ نے خلفائے راشدینؓ کے دل میں یہ خواہش ڈالی" (اتقان ج اول)۔

یک نہ شد دو شد

لہٰذا یہ عذر دوبارہ غور سے پڑھیئے۔ کہنے والے نے کہا ہے کہ بعض احکام یا تو تلاوت میں منسوخ ہو جاتے تھے اور ان کا حکم باقی رہتا تھا اور یا پھر حکم بھی منسوخ ہو جاتے تھے[1]۔ اس لئے حضورؐ کو انتظار رہا کہ وہی چیز کتابی شکل میں امت کے حوالے کریں جو بعد میں منسوخ نہ ہو۔ کچھ سمجھے آپ؟ آپ کو تو یہ اعتراض تھا کہ قرآن حضورؐ کے عہد میں جمع کیوں نہیں کیا گیا؟ خطابی صاحب کہتے ہیں کہ قرآن کی بعض آیات ایسی بھی تھیں جو تلاوت میں منسوخ ہو گئیں یعنی وہ موجودہ قرآن میں نہیں ہیں مگر ان کا حکم باقی ہے اور کچھ آیتیں ایسی تھیں جن کا حکم بھی باقی نہیں اور قرآن میں ان کا وجود بھی نہیں۔ یعنی معاذ اللہ قرآن میں کمی ہو گئی ہے۔ اور اس کی بعض آیات خارج کر دی گئی ہیں[2]۔

بخاری شریف کی روایات جمع قرآن

اب حدیث کی اس معروف کتاب کی روایات دیکھیئے جسے کتاب اللہ کے بعد دنیا کی صحیح ترین کتاب مانا گیا ہے اس سے بھی آپ کو یہی معلوم ہوگا کہ قرآن عہدِ رسالت میں جمع نہیں ہوا تھا۔

"ہمیں موسیٰ بن اسمٰعیل، ابراہیم بن سعد، شہاب زہری اور عبید بن السباق کے واسطوں سے زید بن ثابتؓ کی یہ روایت معلوم ہوئی ہے وہ فرماتے تھے کہ جنگ یمامہ کے بعد ابوبکرؓ نے مجھے بلانے کے لئے ایک آدمی بھیجا۔ میں وہاں پہنچا تو عمرؓ بن الخطاب بھی ان کے پاس تھے ابوبکرؓ نے فرمایا کہ عمرؓ میرے پاس آئے اور کہا کہ جنگ یمامہ میں حفاظِ قرآن بہت قتل ہوئے ہیں اور میں ڈرتا ہوں کہ اگر حفاظ اسی طرح قتل ہوتے رہے تو قرآن کا بہت سا حصہ ضائع ہو جائے گا۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ قرآن جمع کروا لیں۔ میں نے کہا عمرؓ! تم ایسا کام کس طرح کرو گے جو رسولِ خدا صلعم نے نہیں کیا "عمرؓ نے کہا، بخدا یہ کارِ خیر ہے۔ چنانچہ عمرؓ بار بار میرے پاس آتے رہے۔ یہاں تک کہ اللہ نے میری شرح صدر کر دی اور میں نے بھی ان کے قول کو

---

[1] ناسخ منسوخ کے مسئلہ پر آگے چل کر بحث کی جائے گی۔ (رفیق)

[2] تفصیل آگے آ رہی ہے۔ (رفیق)

عمائب و مناسب خیال کیا" زیدؓ کہتے ہیں پھر ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا۔ تم ایک جوان آدمی ہو۔ عاقل ہو تم پر ہم کسی قسم کی تہمت نہیں پاتے۔ تم رسولِ خدا صلعم کے کاتبِ وحی بھی رہے ہو تو قرآن کو تلاش کرو اور اسے جمع کرو۔" زید کہتے ہیں "واللہ اگر یہ لوگ مجھے کسی پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ اٹھالے جانے کا حکم دیتے تو بھی مجھ پر اتنا گراں نہ گزرتا جتنا یہ کام مجھ پر گراں گزرا۔ میں نے ابوبکرؓ و عمرؓ سے کہا کہ آپ حضرات ایسا کام کرتے ہیں جو رسولِ خدا صلعم نے نہیں کیا۔ ابوبکرؓ نے فرمایا خدا کی قسم یہ کارِ خیر ہے۔ پھر ابوبکرؓ مجھے بار بار کہتے رہے یہاں تک کہ اس کام کے لئے میرا سینہ کھل گیا جس طرح ابوبکرؓ و عمرؓ کا سینہ کھلا تھا تو میں قرآن کے حصے ڈھونڈھنے لگا اور جمع کرنے لگا۔ لکڑی کے ٹکڑوں۔ ٹھیکریوں اور لوگوں کے سینوں سے۔ حتیٰ کہ سورہ توبہ کا آخر مجھے ابوخزیمہ انصاری کے سوا کسی کے پاس نہ ملا۔ لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ ۔ خاتمہ سورۂ توبہ تک۔ یہ جمع کردہ صحیفے حضرت ابوبکرؓ کی زندگی تک ان کے پاس رہے پھر حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور ان کی زندگی تک ان کے پاس رہے۔ پھر ام المومنین حضرت حفصہؓ بنت عمرؓ کے پاس رہے۔" (بخاری شریف باب جمع القرآن)

بالکل اسی طرح کی روایت امام بخاری کتاب التفسیر میں بھی لائے ہیں۔ اس کا متن دینے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اس روایت میں چونکہ متابعتوں کا ذکر کیا گیا ہے اسلئے ہم انہی کی تصریح کرتے ہیں مگر سب سے پہلے متابعت کی تعریف لکھتے ہیں تاکہ جو لوگ فنِ حدیث کی اصطلاحات سے واقف نہیں ان کے لئے بات مبہم نہ رہ جائے۔

متابعت کی تعریف

کسی حدیث کی روایت ایک راوی کر رہا ہے۔ دوسرا بھی اگر ویسی ہی روایت کرتا ہے تو اس کو متابعت کہتے ہیں۔ اور یہ متابعت پہلی روایت کو تقویت دیتی ہے۔ بشرطیکہ دوسرا راوی پہلے راوی سے ضعیف نہ ہو۔ نیز متابعت اسی صورت میں روایت کو تقویت دیتی ہے۔ جب وہ شخص ثقہ اور قابلِ استناد ہو۔ جس سے دونوں راوی روایت کر رہے ہیں اگر وہ بھی ضعیف ہو تو پھر ایک دو نہیں پچاس ساٹھ متابعتیں بھی کوئی فائدہ نہیں دے سکتیں۔

امام بخاریؒ کی متابعات

کتاب التفسیر والی روایت بالکل جمع القرآن والی روایت کی طرح ہے صرف اتنا فرق ہے کہ وہاں یہ کہا گیا تھا کہ سورۂ توبہ کا آخر ابوخزیمہ انصاری کے پاس ملا۔ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ سورۂ توبہ کی آخری دو آیات خزیمہ انصاری کے پاس ملی تھیں۔ اس روایت کی متابعت عثمان بن عمر اور لیث نے کی ہے۔ جسے یہ علی الترتیب یونس اور ابن شہاب سے روایت کرتے ہیں۔ لیث نے باب جمع القرآن والی روایت میں بھی متابعت کی ہے اور وہاں ابوخزیمہ انصاری کہا ہے۔ تیسری متابعت ابوثابت کی ہے جو یہ کہتا ہے کہ مجھے ابراہیم نے بتایا کہ سورۂ توبہ کی آخری آیت لَقَدْ جَاءَكُمْ ... الخ خزیمہ یا ابوخزیمہ کے پاس تھی۔ کتاب الاحکام میں امام بخاریؒ یہی روایت بیان کرتے ہیں جو تمام تر دوسری روایات کے مطابق ہے۔ صرف اتنی بات ہے کہ یہاں سورہ توبہ کی صرف ایک

آیت ملنے کا ذکر ہے اور جس کے پاس سے ملی ہے اس کا صحیح تعارف معلوم نہیں کہ خزیمہ تھا یا ابو خزیمہ۔ تیسرا اس میں یہ بھی ہے کہ زیدؓ بن ثابت نے کہا "جب مجھے آخری آیت ملی تو میں نے اسے اس کی سورت میں لکھ دیا گویا پہلے سے علم تھا کہ یہ آیت سورۂ توبہ کی ہے"

یہ روایات آپ نے دیکھ لیں۔ اب ذرا تنقیدی نظر بھی ان پر ڈال لیجئے۔

مذکورہ روایات میں اختلافات

ان روایات میں یہ اختلافات آپ دیکھ چکے ہیں۔

(ا) باب جمع القرآن والی روایت میں ہے کہ سورۂ توبہ کا آخر ابو خزیمہ انصاری کے پاس ملا اگرچہ آخر کا کوئی تعین نہیں تاہم جو آیات بیان کی ہیں وہ دو ہی ہیں۔

(ب) کتاب التفسیر کی روایت میں ہے کہ یہ دو آیتیں خزیمہ انصاری کے پاس پائی گئیں۔

(ج) کتاب الاحکام والی روایت میں ہے کہ صرف ایک آیت خزیمہ یا ابو خزیمہ کے پاس ملی۔ ابھی انہی اختلافات کو مدنظر رکھئے اور ان مختصر روایات پر نظر ڈالئے جو امام بخاری دیگر مقامات پر بیان کرتے ہیں۔

جمع قرآن کی مختصر روایات

"یحییٰ بن بکیر، لیث، یونس، ابن شہاب اور ابن السباق کے واسطوں سے روایت کرتے ہیں کہ زید بن ثابت نے فرمایا کہ مجھے ابو بکرؓ نے بلایا تو فرمایا تم رسول خدا کے کاتب وحی تھے۔ پس قرآن کو ڈھونڈو۔ میں تلاش کرنے لگا حتیٰ کہ آخر سورۂ توبہ کی دو آیتیں مجھے ابو خزیمہ انصاری کے سوا کسی کے پاس نہ ملیں۔" (بخاری ج ۲ باب کاتب النبی صلعم)

اس روایت سے بھی زیادہ مختصر روایت یہ ہے جس کا مطلب کبھی سمجھ میں نہ آ سکتا۔ اگر دوسری مفصل روایات نہ ہوتیں۔

"موسیٰ، ابراہیم۔ ابن شہاب زہری اور عبید بن السباق کے واسطوں سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت زیدؓ نے فرمایا میرے پاس ابو بکرؓ نے بھیجا تو میں قرآن ڈھونڈنے لگا۔ یہاں تک سورۂ توبہ کا آخر ابو خزیمہ انصاری کے پاس ملا۔" (بخاری ج ۲ کتاب التوحید)

غور کیجئے تو یہ مختصر روایات محض اس لئے لائی گئی ہیں کہ اس روایت کو تقویت ملے جس میں خزیمہ کی بجائے ابو خزیمہ کا نام لیا گیا ہے ورنہ ان روایات سے کوئی خاص مطلب حاصل نہیں ہوتا۔

مسند احمد کی متابعات

۱۔ امام احمد عبداللہ، ان کے والد، عثمان بن عمر، یونس، زہری اور ابن السباق کے واسطوں سے اسی طرح کی روایت بیان کرتے ہیں مگر اس روایت میں نہ خزیمہ یا ابو خزیمہ کا ذکر ہے نہ آخر سورۂ توبہ کی آیات کا۔ البتہ اس میں لایوعیٰ کا خطرناک اضافہ کیا گیا ہے جس کا مطلب ہے قرآن کے وہ حصے ضائع ہو جائیں گے جو کچھ کسی کو یاد ہیں کچھ کسی کو۔ (مسند احمد ج اول)

لہ اس بات کو ذہن میں رکھئے اس کا حوالہ آگے آئے گا۔ (سیفی)

ایک دوسری روایت میں بھی بالکل اسی طرح کا واقعہ بیان کیا گیا ہے جو پہلے بخاری شریف کے حوالے سے لکھا جا چکا ہے اس میں بھی سورۂ توبہ کی آیت کا خزیمہ یا ابو خزیمہ کے پاس ملنے کا کوئی ذکر نہیں اس کے راوی ہیں ابو کامل مظفر بن مدرک ابراہیم بن سعد ابن شہاب زہری ابن اسحاق۔ (مسند احمد ج ۵)

ترمذی کی ایک روایت

امام ترمذی اپنی روایات کی متابعت میں مشہور محدث عبدالرحمٰن بن مہدی سے روایت کرتے ہیں اور وہ ابراہیم بن سعد سے روایت کرتے ہیں اس روایت میں کہا گیا ہے کہ سورۂ توبہ کی آخری آیات خزیمہ بن ثابت کے پاس سے ملیں۔ (ترمذی شریف)

مباحث گزشتہ پر ایک نظر

متذکرۂ صدر روایات پر ایک نظر ڈالیے تو آپ کو مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوں گی۔

(ا) عہد رسالت میں قرآن جمع نہیں ہوا تھا۔

(ب) جنگ یمامہ میں حفاظ شہید ہوئے تو حضرت عمرؓ کو جمع قرآن کا خیال آیا۔

(ج) حضرت ابوبکرؓ پہلے اس کام پر آمادہ نہ تھے ان کی دلیل یہ تھی کہ جب حضور صلعم نے یہ کام نہ کیا تو ہم کیونکر کریں۔ بعد میں ان کی شرح صدر ہوئی۔

(د) حضرت عمرؓ نے کہا یہ کار خیر ہے۔

(ہ) حضرت زید بن ثابتؓ نے اسے بارگراں سمجھا اور وہی دلیل پیش کی کہ جب حضورؐ نے یہ کام نہ کیا تو آپ کیوں کرنا چاہتے ہیں؟

(و) حضرت ابوبکرؓ نے کہا یہ کار خیر ہے۔

(ز) آخر سورۂ توبہ کی ایک یا دو آیات صرف خزیمہ یا ابو خزیمہ کے پاس ملیں۔

ان چیزوں کو ذہن میں رکھیے اور سوچیے کہ اس طرح کی روایات سے حضور صلعم کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے سب سے پہلی چیز تو یہ سامنے آتی ہے کہ قرآن کو کتابی شکل میں امت کے حوالہ نہ کرنا فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی کے مترادف تھا اور (معاذ اللہ) حضورؐ سے یہ کوتاہی سرزد ہوئی۔ دوسرے حضور صلعم کی نگاہ (معاذ اللہ) اس قدر دقیق نہ تھی جتنی حضرت عمر فاروقؓ کی تھی۔ ابوبکرؓ و عمرؓ نے جمع قرآن کو کار خیر قرار دیا مگر یہ کار خیر حضورؐ سے نہ ہو سکا۔ (استغفراللہ)

یہ ہے "روایات کا قرآن" جسے اگر زید بن ثابت جمع نہ کرتے تو وہ کالعدم ہو جاتا۔ اب ہم بخاری شریف کی متذکرہ روایات پر ایک تنقیدی نظر ڈالتے ہیں اور یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ان کی تاریخی حیثیت کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم اسی علم اسماء الرجال سے مدد لیں گے جو روایات پرست حضرات کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔

بخاری شریف کی روایات ہم نے پوری اسناد کے ساتھ درج کی ہیں ان پر ایک مرتبہ پھر نظر ڈالیے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ

متذکرہ روایات کے اصل راوی

جمع قرآن کی روایت، زید بن ثابت صرف عبید بن السباق کو بتاتے ہیں وہ اس کا ذکر صرف شہاب زہری سے کرتے ہیں۔ اور زہری سے پھر مختلف لوگ روایت کرتے ہیں گویا زہری تک یہ روایت خبر واحد کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے اصل راوی عبید بن السباق اور شہاب زہری ہیں۔ ہم مختصراً ان دونوں راویوں پر جرح کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ لوگ اس معیار پر بھی پورے نہیں اترتے جو ہمارے علماء کے ہاں مسلم ہے۔

عبید بن السباق

یہ ثقیف یا ان کے موالی میں سے تھے ان کے دادا پردادا کا حال کسی کو معلوم نہیں۔ ابن سعدؒ نے اُن کے تعارف میں بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"مذی کے بارے میں ابن السباق نے سہل بن حنیف سے روایت کی ہے۔ ابن عباسؓ سے بھی روایت کرتے ہیں۔" (طبقات ابن سعد)

مذی کے بارے میں جس روایت کا ابن سعد نے ذکر کیا ہے وہ یہ ہے۔

مذی کی روایت

"سہل بن حنیف کہتے ہیں میں کثرتِ مذی سے عاجز تھا اور بار بار غسل کرتا تھا میں نے رسول خدا صلعم سے ذکر کیا انہوں نے فرمایا تمہارے لئے وضو کافی ہے۔ میں نے عرض کیا کپڑے پر جو مذی کا اثر آجاتا ہے اس کا کیا ہو؟ فرمایا چلو بھر پانی اس پر چھڑک دینا کافی ہے۔"

ابن سعد کے بیان کے مطابق سہل بن حنیف سے انہوں نے صرف مذی کی روایت لی ہے۔ یہ روایت بھی ایسی ہے جس میں ابن السباق منفرد ہیں اسی لئے ائمہ احناف، شوافع، اسحاق بن راہویہ وغیرہم اکابر فقہا و محدثین نے اس کے خلاف فتویٰ دیا۔ روایت کیسی ہی ہو سوال یہ ہے کہ سہل بن حنیف سے کب انہوں نے یہ روایت سُن لی تھی؟ کیونکہ امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ ابن السباق ۱۱۸ھ میں ۷۸ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ اس طرح ان کی ولادت ۴۰ھ میں ہوئی ہوگی اور علامہ ابن حجر لکھتے ہیں کہ سہل بن حنیف ۳۸ھ میں فوت ہو چکے تھے۔ معلوم نہیں اپنی ولادت سے ۱۲ سال پیشتر ابن السباق نے یہ روایت کیسے سُن لی تھی۔

رہی یہ بات کہ وہ ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں تو یہ اگرچہ ابن سعد کے اتباع میں ابن حجر نے بھی لکھ دیا ہے مگر آخر ان کی وہ روایات ہیں کہاں جو انہوں نے ابن عباسؓ سے سنی تھیں۔ موجودہ کتب احادیث میں اور خصوصاً مسند احمد میں جو ایک طرح ابن عباسؓ کی روایات کا ہی مجموعہ ہے، ابن عباسؓ کی کوئی ایسی روایت نہیں جس کے راوی ابن السباق ہوں۔

تعجب بالائے تعجب تو یہ ہے کہ ابن سعد نے یہ تک نہیں کہا کہ وہ زید بن ثابت سے روایت کرتے ہیں بلکہ

لہ تاریخ کبیر۔ تہذیب التہذیب

جمع قرآن والی روایت کا نام بھی نہیں لیا

جمع قرآن والی مشہور روایت جس کے تقریباً تمام طرق میں ابن السباق کا نام لیا گیا ہے۔ اس کا ذکر تک ابن سعد نے نہیں کیا۔ ابن السباق کے تعارف میں ابن حجر سے بعض عجیب تسامحات ہوتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ابن السباق اسامہ بن زیدؓ

ابن حجر اور ابن السباق

ام المومنین میمونہؓ اور ام المومنین جویریہؓ سے بھی روایت کرتے ہیں"

(تہذیب التہذیب ترجمہ ابن السباق)

لیکن وہی ابن حجر کہتے ہیں۔

"ام المومنین جویریہؓ کی وفات سنہ ۵۰ھ میں ہوئی" (تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۴۰۷)

اور "ام المومنین میمونہؓ کی وفات سنہ ۵۱ھ میں ہوئی" (تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۴۵۳)

اور ابن السباق کی ولادت سنہ ۵۰ھ کی ہے۔ نہ معلوم وہ ان سے کب حدیثیں سنتے رہے۔ اصل میں یہ ابن حجر کی لغزش ہے کیونکہ حضرت جویریہؓ اور حضرت میمونہؓ سے ابن السباق نے کوئی روایت نہیں کی نہ ہی اسامہ بن زیدؓ کی کوئی روایت ابن السباق کے واسطے سے بیان ہوئی ہے۔

حضرت زیدؓ بن ثابت اور ابن السباق

زید بن ثابت سے ابن السباق کی مشہور روایت جمع قرآن بعہد ابوبکرؓ ہے یہ روایت بخاری، ترمذی، مسند احمد اور متعدد کتب حدیث میں موجود ہے اور اسی روایت کی اصلیت معلوم کرنے کے لئے ابن السباق کا تعارف لکھا جا رہا ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ روایت بھی مشکوک ہے کیونکہ ائمہ جرح و تعدیل نے حضرت زیدؓ بن ثابت کی وفات کے متعلق چار قول نقل کئے ہیں۔ یعنی سنہ ۴۵ھ، سنہ ۴۸ھ، سنہ ۵۱ھ، سنہ ۵۵ھ۔ ان اقوال میں سے صحیح ترین قول سنہ ۴۵ھ تسلیم کیا گیا ہے۔ خود ابن حجر نے بھی اسی کو صحیح قرار دیا ہے اور آپ دیکھ چکے ہیں کہ ابن السباق سنہ ۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ تعجب ہے کہ وہ سنہ ۴۵ھ میں وفات پانے والے صحابی سے کس طرح بات سن لیتے ہیں؟ اور اگر سنہ ۵۵ھ بقول ضعیف حضرت زیدؓ بن ثابت کا سن وفات ہو تب بھی اس وقت ابن السباق کی عمر ۵ سال ہوگی سو پانچ سالہ بچے کی روایت کیسے قابل قبول ہو سکتی ہے۔ یہ تو تھا اس روایت کا ایک ستون — ابن السباق — اب دوسرے ستون شہاب زہری کی طرف آئیے۔

شہاب زہری

زہری مدینہ کے نہیں ایلہ کے رہنے والے تھے لوگوں نے غلطی سے انہیں مدنی سمجھ لیا ہے۔ یہ غلطی اس لئے ہوئی کہ انہیں قبیلہ بنو زہرہ کا ایک فرد سمجھ لیا گیا حالانکہ قبیلہ بنو زہرہ کے افراد میں

لہ تہذیب التہذیب۔

محمد بن شہاب زہری نام کے نزدیک نشان دہی کسی کتاب میں نہیں ملتی۔ کثیر الروایت میں حافظ ابن حجر نے ان کے شیوخ کی تعداد ستر بتائی ہے۔ جن میں شیعہ بھی شامل ہیں۔

زہری مرسل روایتوں کے عادی تھے

زہری ارسال کے خوگر تھے۔ درمیان سے اپنے شیخ کا نام چھوڑ کر اپنے شیخ کے شیخ سے بلاواسطہ روایت کرنا ارسال کہلاتا ہے۔ اہل حدیث نے مرسل، مرسل خفی اور منقطع میں فرق کیا ہے اگرچہ ان کی تعریفوں کے متعلق علماء محدثین مختلف الرائے ہیں۔ مگر مرسل خفی کو عموماً ہلکا سمجھا جاتا ہے۔ زہری کی مرسلات کو خفی بھی سمجھ لیجئے تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ وہ ارسال کرتے تھے۔ ارسال کے سلسلے میں ہم صرف حضرت عروہؓ بن الزبیر کی روایات کا ذکر کرتے ہیں۔ ابن حجر نے تصریح کی ہے کہ

"زہری کا عروہ سے حدیثیں سننا ثابت نہیں۔" (تہذیب التہذیب ترجمہ ابن شہاب زہری)

تاہم عروہؓ بن الزبیر سے بیشتر روایات ہیں جن کا راوی زہری ہے۔ اور ان روایات کا اکثر حصہ صحاح میں ہے بخاریؒ مسلمؒ میں بھی سو سے زیادہ ایسی حدیثیں ہیں حالانکہ بخاری کے متعلق علماء نے مشہور کر رکھا ہے کہ روایت کے لئے ان کی کڑی شرط یہ تھی کہ راوی اور مروی عنہ (جس سے روایت لی گئی ہے) میں ملاقات ثابت ہو۔ اصل یہ ہے کہ یہ شرط بھی ہمارے علماء کرام نے یوں ہی امام بخاری کی طرف منسوب کر دی ہے ورنہ انہوں نے اپنی کتاب میں ان شرائط کا تذکرہ نہیں کیا۔ خیر بہرحال یہ ثابت ہے کہ زہری ارسال کے عادی تھے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کا ارسال کیسا تھا؟

زہری کی مرسلات

علامہ ابن حجر لکھتے ہیں کہ مشہور محدث یحییٰ بن سعید جو فن رجال کے بھی امام تھے فرمایا کرتے تھے۔

"زہری کے مرسلات بمنزلہ ریح ہیں۔" (تہذیب التہذیب ترجمہ زہری)

زہری کا ارسال کیسا تھا

علامہ ذہبی لکھتے ہیں۔

"ابو قدامہ سرخسی یحییٰ بن سعید سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فرماتے تھے زہری کے مرسلات تمام مرسلات سے بدتر تھیں کیونکہ وہ حافظ حدیث تھے ہر راوی کا نام انہیں یاد تھا لیکن وہ وہیں راوی کا نام نہیں لیتے جہاں وہ اس کا نام لینا مناسب نہیں سمجھتے۔ یعنی جان بوجھ کر وہ راوی کا نام نہیں لیتے۔" (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص۱۰۶)

زہری کی مرسلات کی تعداد

علامہ ذہبی لکھتے ہیں۔

"ابوداؤد نے کہا زہری کی روایات بائیس سو ہیں جن میں سے آدھی مسند ہیں اور آدھی مرسل۔"

(تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص۱۰۶)

زہری ادراج کے بھی خوگر تھے

ادراج کے معنی ہیں حدیث رسول صلعم میں اپنی طرف سے کچھ الفاظ ملا دینا اور زہری کو بھی یہ عادت تھی۔ سنئے۔

"زہری حدیث میں اپنی بات ملا دیا کرتے تھے اسی لئے موسیٰ بن عقبہ نے انہیں ایک مرتبہ کہا تھا کہ رسول اکرم صلعم کے کلام سے اپنے کلام کو الگ رکھا کرو۔"

(کتاب المختصر من المختصر ص۱۲۵)

زہری مُدلّس تھے

تدلیس یہ ہے کہ راوی سلسلۂ روایت کے کسی نام میں ایسی کوئی صورت اختیار کرے جس سے اس کی شخصیت متعارفہ پر پردہ پڑ جائے اور سننے والے کا خیال کسی اور آدمی کی طرف منتقل ہو جائے۔ یہ تو اسناد کی تدلیس ہوئی۔ متن حدیث میں تدلیس یہ ہے کہ مفہوم میں ایسے ذومعنیین الفاظ استعمال کئے جائیں جن سے حدیث کا صحیح مفہوم حاصل نہ ہو سکے۔ بلکہ دو طرح کے مطالب اخذ کئے جا سکیں۔ سو یہ بات چاہے بالقصد ہو چاہے بلا قصد۔ بہرحال زہری اس کے عادی تھے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں۔

"امام شافعیؒ، دار قطنی اور اکثر لوگوں نے زہری کو مدلس کہا ہے۔" (طبقات المدلسین ص۱۵)

بہرحال یہ تھے ابن شہاب زہری جو اس روایت میں بالکل منفرد ہیں اور پھر وہ روایت بھی ابن السباق سے ہے جو حضرت زیدؓ بن ثابت کی وفات کے بعد پیدا ہوئے۔ اب آپ ہی سوچئے کہ اس قسم کی روایت کو بنیاد بنا کر ہمارے علمائے کرام کیوں کر یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ قرآن حضورؐ کے عہد میں جمع نہیں ہوا تھا۔

ہم اس روایت کو مندرجہ ذیل دلائل کی بنا پر جھوٹا سمجھتے ہیں اور اگر روایت پرستوں میں کچھ ہمت ہے تو وہ علم و دانش کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر ہمارے مقابلہ میں آئیں اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تو اپنے غلط عقائد سے توبہ کریں۔ اور بخاری و مسلم کی لاج رکھنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالت و عظمت سے نہ کھیلیں۔ ہمارے دلائل یہ ہیں۔

۱۔ ہم پچھلے باب میں قرآن حکیم سے ثابت کر چکے ہیں کہ حضور سرور کائنات صلعم نے قرآن حکیم مرتب صورت میں امت کے حوالے کر کے فریضۂ رسالت ادا کیا تھا لہٰذا یہ روایت قرآن کے خلاف ہے۔

۲۔ اسی روایت کے مطابق قرآن کتابی شکل میں جمع کرنا کار خیر تھا۔ اور کار اہم و عظیم بھی۔ پس یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جس کام کی اہمیت و عظمت فاروق اعظمؓ نے محسوس کی فراست نبویؐ اسے سمجھنے سے عاری تھی۔ (معاذ اللہ) پس یہ روایت درایت کے بھی خلاف ہے۔

۳۔ عبید بن السباق کا زیدؓ بن ثابت سے یہ روایت سننا کسی طرح ممکن نہیں۔ اور ابن شہاب زہری ارسال، ادراج اور تدلیس کے خوگر تھے۔ پس یہ روایت علم اسماء الرجال کی رو سے بھی غلط ٹھہرتی ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ اس روایت پر کافی بحث ہو چکی۔ اب ہم اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ قرآن کو مشکوک ٹھہرانے کے لئے اہل روایات نے کس طرح ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے ابھی ابھی آپ نے پڑھا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کے حکم سے زیدؓ بن ثابت نے قرآن جمع کیا تھا۔ اب اور سنئے۔

قرآن صدیق اکبرؓ نے خود جمع کیا تھا

امام ابن ابی داؤد فرماتے ہیں۔
ابن شہاب زہری سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قرآن جمع تو کر لیا تھا۔ زیدؓ بن ثابت سے صرف یہ درخواست کی تھی کہ وہ اس پر نظر ثانی کر لیں۔ مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ حتیٰ کہ حضرت صدیقؓ نے عمر فاروقؓ سے مدد طلب کی تاکہ وہ زیدؓ بن ثابت کو راضی کرا دیں۔ حضرت فاروقؓ نے انہیں راضی کر لیا۔ اور حضرت زیدؓ نے نظر ثانی فرمائی۔ یہ مصحف ابوبکرؓ کی وفات تک ان کے پاس رہا۔ پھر فاروق اعظمؓ کی وفات تک ان کے پاس رہا۔ پھر حضرت حفصہؓ کے پاس آیا۔" (کتاب المصاحف۔ کنز العمال)

وہی زہری

دیکھئے اس روایت کے راوی بھی وہی زہری ہیں جو ابھی کہہ رہے تھے کہ قرآن زیدؓ بن ثابت نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے حکم سے جمع فرمایا تھا اور اب کہتے ہیں قرآن جمع تو خود ابوبکر صدیقؓ نے کیا تھا۔ زیدؓ بن ثابت نے نظر ثانی فرمائی۔ یہ معمہ ان حضرات سے حل کرائیے جو روایات کو سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔ اور ہمیں طعنے دیتے ہیں کہ یہ لوگ حدیث رسولؐ کے منکر ہیں اور پھر جاہل بھی ہیں (اللہ ان کا علم "انہیں نصیب کرے")۔

روایات پرستو! صدیق اکبرؓ کی عظمت سے نہ کھیلو

اس روایت میں یہ ظلم روا رکھا گیا ہے کہ تاجدار خلافت، حبیب رسولؐ خلیفہ رسولؐ امیر المومنین جناب ابوبکر صدیقؓ کی شان اقدس و اعظم میں گستاخی کی گئی ہے۔ غور کیجئے کہ وہ شخصیت عظمیٰ جس کی عمر کی ایک ایک گھڑی قابل رشک تھی۔ جس نے ہجرت کی رات حضورؐ کا ساتھ دیا اور سچ پوچھو تو وہ ایک رات ہی دوسروں کی عمر بھر کی عبادتوں پر فائق ہے۔ وہ پیکر عظمت و جلالت جس کی زندگی آغاز نبوت سے حضورؐ کی عمر کی آخری سانس تک حضورؐ کی رفاقت میں گزری تھی اگر وہ ماہر قرآن نہ تھے تو کون ماہر قرآن تھا۔ صدیق اکبرؓ قرآن جمع کریں اور پھر زیدؓ بن ثابت سے نظر ثانی کی درخواست کریں اور جب وہ انکار کریں تو فاروق اعظمؓ کی مدد سے انہیں آمادہ کیا جائے؟ کیا فاروق اعظمؓ خود نظر ثانی نہیں فرما سکتے تھے؟ اگر (معاذ اللہ) انہیں بھی قرآن نہ آتا تھا تو پھر کیا مدینۃ النبیؐ میں کوئی صحابی ایسا نہ رہ گیا تھا کہ بار بار حضرت زیدؓ کو اس کام کے لئے آمادہ کیا جاتا۔ اور آخر حضرت زیدؓ نے انکار کیوں کیا؟ کیا یہ کوئی گناہ تھا کہ امیر المومنین کی اطاعت نہ کی جائے؟ اور اگر گناہ تھا تو کیا گناہ نہ تھا کہ امیر المومنین کی حکم عدولی کی گئی مگر فاروق اعظمؓ کے کہنے سے ارتکاب کر لیا گیا؟

زیدؓ بن ثابت میں کیا خصوصیت تھی؟

آخر دوسرے صحابہ کرامؓ کے مقابلہ میں حضرت زیدؓ بن ثابت میں کیا خصوصیت تھی کہ جناب صدیقؓ اپنا مجموعہ انہیں دکھانے کے لئے منتیں کرتے ہیں؟

کیا حضرت معاذؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ وغیرہم زندہ نہ تھے؟

غور کیجئے اور پھر خود ہی فیصلہ فرمائیے کہ آپ کی کتب روایات میں ان چیزوں کا وجود ہمارے لئے باعث عار نہیں؟

قرآن حضرت صدیقؓ نے کیسے جمع کیا؟

موسیٰ بن عقبہ لکھتے ہیں۔

"ابن شہاب زہری سے روایت ہے کہ جب جنگ یمامہ میں مسلمانوں پر مشکل وقت آیا تو حضرت ابوبکرؓ گھبرائے اور ڈرے کہ کہیں قرآن کا ایک حصہ ضائع نہ ہو جائے تو جس کے پاس جو کچھ تھا لے آیا یہاں تک کہ عہد صدیقیؓ میں قرآن اوراق میں جمع ہو گیا تو ابوبکرؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے قرآن مصحف میں جمع کیا۔ (کتاب المغازی)

جنگ یمامہ اور صدیق اکبرؓ کی پریشانی!

بخاریؒ کی روایات میں ہے جنگ یمامہ کے بعد حضرت فاروقؓ کے دل میں خوف پیدا ہوا۔ یہاں وہی خوف حضرت صدیقؓ کے دل میں پیدا ہو رہا ہے اس روایت میں بھی وہی بات کہی گئی کہ قرآن کچھ کسی کے پاس تھا کچھ کسی کے پاس اور حضرت صدیقؓ کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں قرآن ضائع نہ ہو جائے۔

جنگ یمامہ اور جنگ بیر معونہ

جس جنگ یمامہ کا ڈھول بار بار پیٹا جاتا ہے اس میں ابن اثیر کی روایت کے مطابق ۵۰ صحابہؓ شہید ہوئے تھے۔ استیعاب میں ایک ریاح بن الربیع کے نام کا بھی اضافہ کیا گیا ہے تو ۵۱ ہوئے اور اگر امام قرطبی کا قول بھی تسلیم کر لیا جائے تو ستر حفاظ قرآن جنگ یمامہ میں شہید ہوئے تھے۔ مگر جنگ بیر معونہ میں بھی ستر حفاظ قرآن شہید ہوئے۔ یہ جنگ عہد رسالت میں ہوئی۔ سوال یہ ہے کہ وہی تعداد جب جنگ بیر معونہ میں شہید ہوتی ہے تو فراست نبویؐ (معاذ اللہ) اس بات سے عاجز رہتی ہے کہ قرآن جمع کر لیا جائے مگر جب جنگ یمامہ میں اتنے ہی حفاظ شہید ہوتے ہیں تو حضرت ابوبکرؓ یا حضرت عمرؓ کی فراست کام کر جاتی ہے۔ آخر کیوں؟ کیا حضورؐ کی فراست ان حضرات سے کم تھی؟

پھر وہی زہری

تعجب تو اس امر پر ہے کہ اس روایت کے راوی بھی وہی زہری ہیں۔ معلوم نہیں یہ واقعات دوسرے لوگوں کو کیوں کوئی نہیں بتاتا؟

خیر پہلے آپ نے روایت کی بنا پر یہ نظریہ قائم کیا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کے حکم سے حضرت زیدؓ بن ثابت نے قرآن جمع کیا تھا۔ اب فوراً نظریہ بدلئے اور یہ یقین کیجئے کہ حضرت ابوبکرؓ نے خود قرآن جمع کیا تھا۔ اور ابھی نہ جانے آپ کو کتنی مرتبہ نظریات بدلنے پڑیں۔

لہ الاتقان ج اول ص

جمع قرآن کا کام حضرت عمرؓ نے شروع کیا تھا اور حضرت عثمانؓ نے مکمل کیا تھا!

امام ابن ابی داؤد فرماتے ہیں۔

"یحییٰ بن عبد الرحمٰن بن حاطب سے روایت ہے کہ عمرؓ بن الخطاب نے قرآن کو جمع کرنے کا ارادہ فرمایا اور خطبہ میں لوگوں کو اپنے اس ارادہ سے آگاہ فرمایا اور حکم دیا کہ جس شخص نے رسول خدا صلعم سے کچھ بھی قرآن حاصل کیا ہو ہمارے پاس لے آئے۔ لوگوں نے قرآن اوراق پر لکڑی کی تختیوں پر، کھجور کے پٹھوں پر لکھ رکھا تھا وہ لے آئے۔ فاروقِ اعظمؓ کسی کی کوئی چیز قبول نہ کرتے تھے۔ جب تک دو گواہ گواہی نہ دے دیں۔ اسی اثنا میں حضرت عمرؓ شہید ہو گئے تو حضرت عثمانؓ کھڑے ہوئے اور انہوں نے لوگوں کو کہا کہ جس کے پاس قرآن کا کچھ حصہ ہو لے آئے وہ بھی دو گواہوں کی گواہی کے بغیر کوئی چیز قبول نہیں کرتے تھے چنانچہ خزیمہ بن ثابت آئے اور کہا میں دیکھ رہا ہوں کہ دو آیتیں تم سے رہ گئی ہیں پوچھا گیا وہ کون سی دو آیات ہیں۔ انہوں نے فرمایا میں نے حضورؐ سے یہ دو آیات حاصل کی تھیں لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ الخ۔ اس پر عثمانؓ نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ دو آیات اللہ کی طرف سے ہیں۔ پھر عثمانؓ نے خزیمہ سے پوچھا بتاؤ ان آیات کو کہاں رکھیں؟ خزیمہ نے کہا قرآن کی جو سورت سب سے آخر میں نازل ہوئی ہے اسے ان آیات سے ختم کر دو۔ چنانچہ سورۂ توبہ کو ان آیات سے ختم کیا گیا"[1] (کتاب المصاحف)

لیجئے اب یہ نظریہ قائم کیجئے کہ قرآن نہ حضورؐ نے جمع کرایا تھا نہ صدیق اکبرؓ نے۔ بلکہ حضرت عمرؓ نے جمع کرایا تھا مگر وہ بھی اس کی تکمیل سے پیشتر شہید ہو گئے تب حضرت عثمانؓ نے مکمل کیا۔ اب آگے چلئے۔

قرآن حضرت علیؓ نے جمع کیا تھا

ابن ابی داؤد[2] لکھتے ہیں۔

"ابن سیرین سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ فرماتے تھے کہ جس وقت رسول خدا صلعم نے وفات پائی تو میں نے اپنے دل میں عہد کر لیا کہ جب تک قرآن جمع نہ کر لوں اس وقت تک بجز نماز جمعہ کے اور کسی کام کے لئے اپنی چادر نہ اوڑھوں گا۔ چنانچہ میں نے قرآن کو جمع کر لیا۔" (کتاب المصاحف۔ الاتقان ج اول)

اسی کی تائید میں علامہ ابن الضریس کی روایت بھی سن لیجئے۔

"حضرت علیؓ نے فرمایا میں نے دیکھا کہ کتاب اللہ پر بڑی زیادتی ہو رہی ہے اس لئے اپنے دل میں کہا

---

[1] اس روایت کا آخری حصہ جو حضرت عثمانؓ سے متعلق ہے آگے موضوعِ بحث بنے گا اس لئے اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے (دستیقی)

[2] ابن ابی داؤد بڑے ثقہ بزرگ تسلیم کئے گئے ہیں مضمون کے آخر میں ان کے حالات لکھے جائیں گے۔ (دستیقی)

جب تک اسے جمع نہ کرلوں اس وقت تک بجز نماز کے اور کسی کام کے لئے چادر نہ اوڑھوں" (کتاب الفضائل)

لیجئے اب بات یہاں تک پہنچی کہ سب سے پہلے قرآن حکیم حضرت علیؓ نے جمع کیا تھا۔ اب اور سنئے۔

قرآن سالمؓ نے جمع کیا تھا

علامہ ابن اشتہ کیس کے طریق پر ابن بریدہ سے روایت کرتے ہیں کہ سب سے پہلا شخص جس نے قرآن کو مصحف میں جمع کیا وہ ابو حذیفہؓ کا آزاد کردہ غلام سالم تھا اور اس نے قسم کھائی تھی کہ جب تک قرآن کو جمع نہ کرلوں گا اس وقت تک چادر نہ اوڑھوں گا۔ چنانچہ اس نے قرآن جمع کرلیا۔ پھر لوگوں نے اس امر میں رائے زنی شروع کی کہ اس کا کیا نام رکھا جائے؟ کسی نے کہا کہ سفر نام رکھو پھر کہا گیا کہ یہ یہودیوں کی کتاب کا نام ہے اس لئے یہ ناپسند ہوا۔ پھر کسی نے کہا میں نے اسی طرح کی کتاب کو حبشہ میں مصحف کہتے سنا ہے چنانچہ اس بات پر سب کا اتفاق ہوگیا اور مجموعۂ قرآن کا نام مصحف رکھا گیا" (کتاب المصاحف۔ الاتقان ج اول)

امام سیوطیؒ کی تطبیق

جلال الدین سیوطیؒ نے تطبیق کی کوشش میں لکھا ہے۔

"یہ اس بات پر محمول ہے کہ سالمؓ بھی ابوبکرؓ کے حکم سے قرآن جمع کرنے والوں میں سرگرم تھے" (الاتقان ج اول)

سیوطیؒ صاحب کا فرمان سنا آپ نے؟ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ جب حضرت ابوبکرؓ نے حضرت زیدؓ بن ثابت کو جمع قرآن کا حکم دیا تو حضرت سالم ایک سرگرم رکن تھے۔ اس لئے اس روایت کو اسی بات پر محمول کرنا چاہیئے مگر آپ دیکھ چکے ہیں کہ حضرت زیدؓ بن ثابت جنگ یمامہ کے بعد جمع قرآن پر مامور ہوئے تھے اور یہی سیوطیؒ اسی الاتقان جلد اول کی بیسویں نوع میں لکھ رہے ہیں۔

"ابو حذیفہؓ کے آزاد کردہ غلام سالمؓ بھی جنگ یمامہ میں شہید ہوئے" (الاتقان ج اول)

گویا سیوطیؒ کہہ رہے ہیں کہ جنگ یمامہ میں سالمؓ شہید ہوئے تھے اور پھر جنگ یمامہ کے بعد جب زیدؓ بن ثابت جمع قرآن پر مامور ہوئے تو وہی سالمؓ سرگرم رکن تھے۔ بچارے سیوطیؒ! حاطب اللیل[1] جو ہوئے۔

یہاں تک آپ نے دیکھ لیا کہ جمع قرآن کے اہم موضوع پر ہماری کتب روایات کس طرح مختلف الرائے ہیں۔ اس بحث کو یہیں چھوڑ کر اب بعض دوسرے گوشوں پر توجہ کیجئے۔

قرآن سے یہ تصریح ہم پچھلے باب میں سامنے لا چکے ہیں کہ حضور صلعم کے عہد مسعود میں قرآن

---

[1] حاطب اللیل کے معنی ہیں۔ رات کو ایندھن جمع کرنے والا۔ جو یہ معلوم نہیں کر سکتا کہ خشک لکڑی چنی ہے یا گیلی۔ امام سیوطیؒ کو عام طور پر حاطب اللیل کہا جاتا ہے۔

حضرت صدیق اکبرؓ کے عہد میں قرآن کس چیز پہ لکھا گیا تھا؟

رق منشور میں لکھا جاتا تھا۔ اب دیکھئے "روایات کا قرآن" (جو حضرت صدیقؓ کے عہد میں جمع کیا گیا) کس چیز پر لکھا جاتا ہوگا۔ موسیٰ بن عقبہ لکھتے ہیں۔

"حضرت صدیق اکبرؓ کے عہد میں قرآن اوراق میں جمع ہو کر کتابی صورت اختیار کر گیا"
(کتاب المغازی۔ الاتقان)

مگر علامہ ابن حجر کہتے ہیں۔

"عمارہ بن غزیہ کی روایت میں آیا ہے کہ زیدؓ بن ثابت نے کہا "مجھے حضرت ابوبکرؓ نے حکم دیا اور میں نے قرآن کو کھال کے ٹکڑوں اور کھجور کی شاخوں پر لکھا" (الاتقان ج اول)

ان روایات کا تضاد آپ نے دیکھ لیا؟

زہری اور خارجہ بن زیدؓ

جمع قرآن بعہد صدیقؓ کی جن روایات پر ہم نے بحث کی ہے ان میں زہری ابن السباق، زیدؓ بن ثابت یہ مرکزی راوی ہیں اور تینوں منفرد ہیں حضرت زیدؓ بن ثابت کا منفرد ہونا تو کوئی ضعف نہیں پہنچاتا۔ مگر ابن السباق اور زہری جیسے کچھ ہیں، ہم بتا چکے ہیں۔ اب ایک اور روایت کو لیجئے جس کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ جمع قرآن کی روایت زہری صرف ابن السباق سے ہی نہیں لیتے بلکہ ایک اور شخص سے بھی لیتے ہیں، اور وہ ہیں حضرت زیدؓ بن ثابت کے فرزند خارجہ بن زیدؓ۔ پس اگر ابن السباق کی ولادت سے پہلے ہی حضرت زیدؓ بن ثابت فوت ہو چکے تھے تو کیا حرج ہے؛ خارجہ بن زید موجود ہیں۔

ہمیں اس کے جواب میں ذرا وضاحت سے کام لینا پڑے گا۔

حضرت زیدؓ بن ثابت بروایت صحیح سنہ ۴۵ھ میں فوت ہوئے۔ خارجہ بن زید کی عمر امام بخاری ۷۲ سال بتاتے ہیں۔ ابن حجر نے ان کا سالِ وفات سنہ ۹۹ھ یا سنہ ۱۰۰ھ قرار دیا ہے تو یہ اپنے والد کی وفات کے وقت سات برس کے ہوں گے۔ اور یہ عمر روایت کرنے کی نہیں۔

دوسرے یہ کہ مذکورہ روایت میں امام بخاریؒ نے یہ تصریح نہیں کی یہ عہد عثمانیؓ کے کے متعلق کہہ رہے ہیں یا عہد صدیقؓ کے متعلق جیسے پچھلی روایات میں آخر سورہ توبہ کی آیات خزیمہ یا ابوخزیمہ کے پاس ملنے کا ذکر ہے اور اس روایت میں آخر سورہ احزاب کی آیات کے متعلق وہی کچھ کہا گیا۔ اب ذرا ان روایات کو ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کہ ان روایات میں

۱۔ تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۷۵ نیز تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵ ۲۔ تاریخ اوسط ۳۔ تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۷۵

امام بخاریؒ کا اندازِ بیان کیسا مبہم ہے۔ پہلی روایت۔ اب جمع قرآن میں نقلِ مصاحف بعہدِ عثمان کے بعد اس طرح شروع کی گئی ہے۔

"قال ابن شہاب واخبرنی خارجہ بن زید بن ثابت انہ سمع ابی ثابت" مجھے نقلِ مصاحف کے وقت سورۂ احزاب کی ایک آیت یاد آگئی جو اس مصحف میں مفقود تھی۔ اور جو میں نے حضورؐ کو پڑھتے سنی تھی۔ ہم نے اسے تلاش کیا۔ پس وہ خزیمہ بن ثابت انصاری کے پاس ملی۔ وہ آیت یہ تھی " مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوْا " ہم نے مصحف میں اس آیت کو اس کی سورت میں لکھ دیا۔"

معلوم نہیں اس آیت میں قال ابن شہاب واخبرنی خارجہ میں واؤ کا عطف کس پر ہے صاف نظر آتا ہے کہ اس کا عطف اس سے پہلے والی حدیث پر ہے جس میں نقلِ مصاحف بعہدِ عثمانی والا واقعہ انس بن مالک سے زہری نے روایت کیا ہے مطلب یہ ہے کہ انس بن مالک نے تو صرف نقلِ مصاحف بعہدِ عثمان کا واقعہ بیان کیا ہے اور خارجہ نے یہ اضافہ کیا کہ اس وقت ایک آیت نہیں مل رہی تھی۔ پس یہ اس روایت سے قطعی مختلف ہے جس میں بتایا گیا تھا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں قرآن جمع ہوا۔ اصل یہ ہے کہ جیسا ہم نے عرض کیا وہ روایت صرف زہری اور ابن السباق ہی سے ہے اور یہی اس کے مرکزی راوی ہیں نیز نہ معلوم اتنا بڑا واقعہ صحابہؓ میں سے صرف حضرت زیدؓ بن ثابت کیوں روایت کرتے ہیں اور وہ بھی اپنی وفات سے ۵ سال بعد پیدا ہونے والے ابن السباق کو روحانی طور پر کیوں کر بتا جاتے ہیں اور ابن السباق صرف زہری سے یہ واقعہ کیوں بیان کرتے ہیں اوپر سورۂ احزاب والی جو روایات درج کی گئی ہیں یہ امام بخاری تفسیر سورۂ احزاب اور کتاب الجہاد میں بھی لکھتے ہیں۔ ہر جگہ زہری خارجہ بن زید اور زیدؓ بن ثابت اس کے مرکزی راوی ہیں مگر ہر روایت کے الفاظ مختلف ہیں۔ اور سلسلۂ روایت بھی عجیب ہے۔ جمع قرآن والی روایت میں (جو ابھی لکھی گئی ہے) امام بخاریؒ نہ اپنے شیخ کا نام لیتے ہیں نہ اپنے شیخ کے شیخ کا۔ روایت ابن شہاب زہری سے شروع ہو جاتی ہے۔ جس واؤ عاطفہ کا ذکر کیا گیا ہے اُسے بعض شارحین اس باب کی ابتدائی روایات سے متصل کرتے ہیں۔ اس صورت میں عطف بہت منفصل ہو جائے گا خیر کچھ بھی ہو مگر یہ روایت بیان کرتے ہوئے نہ معلوم بخاری کا اندازِ بیان مبہم کیوں ہے!

ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ روایت بتا رہی ہے کہ سورۂ احزاب کی ایک آیت کھو گئی تھی جو خزیمہ بن ثابت کے پاس ملی۔ وہاں بتایا گیا ہے کہ سورۂ توبہ کی دو آیات صرف خزیمہ یا ابو خزیمہ کے پاس ملی تھیں۔

خزیمہ بھی کوئی احدیدؔ تھے [1]

آپ بھی اس امر پر متعجب ہوں گے اور ہم بھی سخت حیران ہیں کہ جو آیت بھی مفقود ہوتی ہے وہ خزیمہ کے پاس مل جاتی ہے گویا خزیمہ کا لفظ بھی احدیدؔ ہے کہ ہر مرض کا علاج۔ اور پھر یہ بات بھی کان دھرنے کی ہے کہ کہا جاتا ہے ان کی گواہی دو گواہیوں کے برابر ہے۔ سنئے۔

---

[1] احدید مصر کی ایک پیٹنٹ دوائی کا نام ہے جو تقریباً ہر مرض کا علاج بتائی جاتی ہے۔ اسی سے محاورہ بن گیا ہے جو چیز یا جو شخص ہر معاملہ میں کام دے جائے اسے احدید کہتے ہیں۔ اپنے یہاں کے محاورہ میں امرت دھارا کہہ لیجئے۔ (مترجم)

خزیمہ یا ابوخزیمہ یا خزیمہ بن ثابت یا ابوخزیمہ بن ثابت کی گواہی دو گواہوں کے برابر تھی!

علامہ ابن اشتہ لکھتے ہیں۔

"لیث بن سعد سے روایت ہے کہ سب سے پہلے قرآن کو ابوبکرؓ نے جمع کیا اور زیدؓ بن ثابت نے اسے لکھا لوگ حضرت زیدؓ کے پاس قرآن کی آیات لاتے تھے اور وہ بغیر دو معتبر گواہوں کے اسے نہ لکھتے تھے اور سورہ براۃ کا خاتمہ محض ابوخزیمہ بن ثابت کے پاس ملا تو ابوبکرؓ نے فرمایا اسے لکھ لو کیونکہ رسول خدا صلعم نے ابوخزیمہ کی شہادت دو گواہوں کے برابر قرار دی ہے۔ چنانچہ زیدؓ نے اسے لکھ لیا مگر عمرؓ نے آیہ رجم پیش کی تو اسے نہیں لکھا کیونکہ اس بارے میں تنہا عمرؓ کے سوا اور کوئی شہادت بہم نہیں پہنچی[1]" (کتاب المصاحف)

ابن اشتہ کی اس روایت میں چند باتیں اہم ہیں۔

(۱) زیدؓ بن ثابت کے پاس آیت لائی جاتی تو وہ ہر آیت پر دو معتبر گواہوں کی شہادت لیتے۔ یعنی اس معاملہ میں زیدؓ بن ثابت اپنی ذاتی شہادت کو دخل نہ دیتے بلکہ ایک گواہ تو آیت لانے والا ہوتا اور ایک گواہ کی گواہی ضروری ہوتی۔

(۲) مگر جب ابوخزیمہ بن ثابت آیت لاتے ہیں تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا یہ آیت لکھ لو کیونکہ جناب رسول خدا صلعم نے ان کی گواہی دو گواہوں کے برابر قرار دی ہے۔

(۳) حضرت عمرؓ آیہ رجم لائے تو ان کی آیت نہ لکھی گئی کیونکہ اس کا کوئی اور گواہ نہ تھا۔

بالکل اسی طرح امام بخاریؒ نے بھی ایک صحابی کی گواہی کو دو گواہوں کے برابر بیان کیا مگر اس کا نام وہاں خزیمہ انصاری لیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

خزیمہ انصاری جن کی گواہی حضورؐ نے دو گواہوں کے برابر قرار دی تھی۔ (بخاری کتاب الجہاد و تفسیر سورۂ احزاب)

خزیمہ کی گواہی کیوں دو گواہوں کے برابر ہے؟ یہ روایت بخاری شریف میں نہیں

سوال پیدا ہوتا ہے کہ خزیمہ کی گواہی کیوں دو گواہوں کے برابر ہے اور کس موقع پر حضورؐ نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی؟ ان سوالات کے جواب میں بخاری شریف بالکل خاموش ہے۔ ہاں یہ مسئلہ حدیث کی دوسری کتابوں سے حل ہو جاتا ہے مگر معلوم نہیں اس روایت کو امام بخاریؒ نے کیوں درج نہیں فرمایا۔ بالخصوص جبکہ وہ اس کا حوالہ بھی دے رہے تھے۔ خدا جانے وہ اس روایت کو ضعیف سمجھتے تھے یا انہوں نے اس کی تحقیق کی ضرورت ہی نہ سمجھی۔ انہوں نے جو کچھ بھی سمجھا ہو مگر اس سوال کا جواب آج کے فدایان بخاریؒ کو تو دینا چاہیئے۔

---

(۱) آیہ رجم کا ذکر آگے آئیگا۔ (رفیق)

ذوالشہادتین والی عجیب روایت

خیر اگر امام بخاریؒ اس معاملہ میں خاموش ہیں تو ہم آپ کو مایوس نہیں کرتے حدیث کی کتابیں ایک دو تھوڑی ہیں کہ آپ تفصیل نہ پاکر پریشان ہو جائیں۔ ایک میں نہیں دوسری میں مل جائے گی۔ یہیں جگر تھام کر سنئے۔

”ابن شہاب زہری عمارہ بن خزیمہ سے اور اپنے چچا سے جو صحابی تھے روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا صلعم نے ایک اعرابی سے ایک گھوڑا خرید اتو وہ اعرابی آپ کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ تاکہ ان سے گھوڑے کی قیمت لے لے۔ حضورؐ تیز چلنے لگے تاکہ جلد گھر پہنچ کر قیمت ادا کردیں مگر اعرابی آہستہ آہستہ چل رہا تھا راہ میں کچھ لوگ اعرابی کو چھیڑنے لگے اور قیمت چکانے لگے۔ حتیٰ کہ جو قیمت حضورؐ کے ساتھ طے ہوئی تھی اس سے بھی زیادہ دینے لگے اور ان لوگوں کو اس کا علم نہ تھا کہ یہ گھوڑا حضورؐ نے خرید لیا ہے اس وقت اعرابی نے حضورؐ کو پیچھے سے پکارا (کیونکہ وہ اپنی تیز رفتاری کے باعث آگے نکل آئے تھے) اور کہا ”آپ خریدنا چاہتے ہیں یا میں اسے کسی اور کے ہاتھ بیچ دوں اس کی آواز سن کر حضورؐ قریب آئے اور فرمایا ”تم تو میرے ہاتھ بیچ چکے“ اعرابی نے اس بات سے انکار کیا اور کہا میں نے نہیں بیچا اگر معاملہ طے ہو گیا تو گواہ لاؤ۔ آنحضرتؐ حیران تھے کہ گواہ کیسے لائیں؟ کیونکہ اس وقت وہاں کوئی موجود نہ تھا مگر آپ بار بار فرما رہے تھے ہم تجھ سے خرید چکے ہیں اور وہ ہر مرتبہ گواہ مانگ رہا تھا۔ مسلمان اعرابی سے کہتے تھے کہ یہ اللہ کے رسولؐ ہیں جھوٹ نہیں بولتے۔ یقیناً سچ فرماتے ہیں تو کیوں غلط قسم کی ضد میں پڑا ہے لیکن وہ گواہ مانگے جا رہا تھا۔ اتنے میں خزیمہ بن ثابت الانصاری وہاں پہنچے۔ انہوں نے اعرابی کو مخاطب کر کے فرمایا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو نے گھوڑا حضورؐ کے ہاتھ بیچا ہے۔ اس پر نبی صلعم نے دریافت فرمایا تم اس وقت موجود نہ تھے پھر گواہی کس طرح دے رہے ہو؟ خزیمہ نے کہا آپ کی تصدیق کی بنا پر۔ (مگر اب بھی ایک گواہ تھا حالانکہ دو ہونے چاہئیں تھے اس لئے) نبی صلعم نے فرمایا خزیمہ کی گواہی دو گواہوں کے برابر ہے اور اس اعرابی کو شکست دیدی“ (ابوداؤد۔ نسائی)

پھر وہی زہری

اس روایت کے راوی بھی وہی زہری ہیں پہچانا آپ نے؟ واللہ میں سخت متعجب ہوں کہ اس قسم کی روایت کے راوی زہری ہی نکلتے ہیں۔ خیر اس موضوع پر ہم اس وقت کھل کر لکھ سکیں گے جب اس کتاب میں تمدینِ حدیث[1] کا باب سامنے آئے گا۔ اب تو موقع بے موقع یوں ہی رہوار قلم بھڑک کر اس راہ پر جا پڑتا ہے۔

خزیمہ بن ثابت

خزیمہ بن ثابت حضرت علیؓ کے حامیوں میں سے تھے۔ جب مدینہ کے اکابر صحابہؓ حتیٰ کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ صدیقہ بھی حضرت علیؓ سے شہادت عثمانؓ کا قصاص مانگنے لگیں۔ اور حضرت علیؓ نے مجبور ہو کر اپنا پایۂ خلافت کوفہ میں منتقل کیا تو یہ بھی ان کے ساتھ چلے آئے۔ جنگ صفین ۳۷ھ میں حضرت علیؓ کی طرف سے لڑے اور شہید ہوئے۔ چونکہ یہ حضرت علیؓ کے ساتھی تھے اس لئے ان کے فضائل میں شیعہ حضرات نے بکثرت روایات گھڑلی تھیں۔

[1] تمدین الکتاب والحدیث "علامہ رحب" کی مشہور کتاب ہے اس کے پہلے باب کا ترجمہ طلوع اسلام اپریل ۱۹۵۳ء میں شائع ہو چکا ہے دوسرے باب کا ترجمہ آپ پڑھ رہے ہیں (باقی جلد آئندہ)

عمارہ بن خزیمہ کے چچا جو صحابی تھے

خزیمہ بن ثابت کے بیٹے حضرت عمارہ بن خزیمہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے چچا سے یہ روایت سنی تھی اور ان کے چچا صحابی تھے۔ آخر چچا کا نام نہ لینے میں کونسی مصلحت تھی؟ ابن مندہ کہتے ہیں ان کا نام عمارہ بن خزیمہ تھا مگر اسمٰء تاریخ و رجال نے اس نام کے کسی صحابی کی نشاندہی نہیں کی۔ اگر کسی حامی روایت کو اس نام کا صحابی مل جائے تو ہمیں اطلاع دے دیں۔

روایت کا متن

اب ذرا متن پر نظر ڈالئے کیا آپ کی عقلِ سلیم یہ تسلیم کرتی ہے کہ جو شخص حضورؐ کے ساتھ معاملہ کرے پھر جائے اور پھر حضورؐ کو معاذ اللہ جھوٹا قرار دے۔ وہ ایک شخص کی گواہی قبول کرے گا جو خود اقرار کر رہا ہے کہ اس کی گواہی محض اس بات پر ہے کہ حضورؐ ایسا کہہ رہے ہیں۔ اور پھر یہ اور زیادہ تعجب کا مقام ہے کہ حضورؐ خود ہی ایک گواہی کو دو گواہیوں کے برابر قرار دے لیں تو اس کو فریقِ ثانی کیسے قبول کر سکتا ہے؟

ارباب دانش غور کریں

میرے اہل علم بھائیو! خدارا اس روایت پر غور کرو اور مجھے بتاؤ کہ یہ کسی طرح بھی عقل و درایت کی کسوٹی پر کھری ثابت ہو سکتی ہے۔ بلا و حامیانِ حدیث کو ذرا ان سے پوچھو کہ ان کی صحاح میں کیسی غیر صحیح باتیں درج ہیں؟ کیا یہ رسول خدا صلعم پر بہتان نہیں کہ انہوں نے گھوڑا حاصل کرنے کے لئے یہ ڈرامہ کیا ہو گا کہ خزیمہ ان دیکھی گواہی دیں اور پھر آپ نے اس کی گواہی کو خود ہی دو گواہوں کے برابر قرار دیا ہو گا۔ دوستو! تمہیں اللہ نے ایسے زمانہ میں پیدا کیا ہے جب علم و بصیرت کی روشنی سے دنیا منور ہو رہی ہے۔ اس قسم کی روایات سے ان پڑھ اور جاہل ابلہانِ مسجد کو تو وجد میں لایا جا سکتا ہے۔ حجروں کی دنیا میں تو یہ باتیں بڑی معتبر ہیں اور وہاں تو جھوم جھوم کر کہا جاتا ہے کہ دیکھو حضورؐ نے کس طرح اپنے مدِمقابل کو شکست دی۔ مگر جب حجروں سے باہر کی وسیع دنیا میں اسلاف کا یہ سرمایہ لے کر آپ نکلیں گے تو دنیا آپ کے مقدس رسول صلعم کے متعلق کیا رائے قائم کرے گی؟

اے ربِ ذوالجلال

اے ربِ ذوالجلال! تیری کبریائی کی قسم! تیرا مقدس رسول ان الزامات سے پاک ہے۔ اے خدائے بزرگ و برتر! ان لوگوں سے اگر لاعلمی میں یہ حرکات سرزد ہوئی ہیں تو ان کی مغفرت فرما۔ ان لوگوں نے تیرے سچے رسولؐ کی صحیح قدر نہیں پہچانی۔ اپنی عقل و فکر سے کام نہیں لیا اور ایسی ایسی خلافِ عقل باتیں اپنی کتابوں میں درج کیں۔ اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون۔

رجوع الی الموضوع

ابن ابی داؤد کی کتاب المصاحف والی روایت ایک مرتبہ پھر پڑھیئے اور غور کیجئے کہ اس میں کس قدر زہر پھیلایا گیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ابو خزیمہ بن ثابت کی لائی ہوئی آیت قبول کر لی گئی مگر فاروقؓ کی لائی ہوئی آیت رد کر دی گئی۔

روایت پرستو! فاروقِ اعظمؓ کی عظمت سے نہ کھیلو

فاروقِ اعظمؓ کی عظمت و جلالت کو مدِنظر رکھئے اور پھر اس روایت کو دیکھئے جس میں خزیمہ کی گواہی پر فوقیت دی جا رہی ہے اور محض اس کمزور روایت کی بنا پر جس کا ذکر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱) اگر حالات نے اجازت دی تو انشاء اللہ تفسیر کے باب کو بھی اردو میں منتقل کر دوں گا۔ (مترجم)

ابھی ہو چکا۔ غور کیجئے کہ اس قسم کی روایات کن لوگوں نے گھڑی تھیں؟ آخر انہیں اس سے کیا مفاد حاصل ہوا؟ اگر آپ تعمق سے نظر ڈالیں تو آپ کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ یہ روایت شیعہ حضرات نے وضع کی ہوگی اور محض اس لئے کہ ایک طرف تو حضرت علیؓ کے حامی حضرت خزیمہؓ کی جلالتِ شان مسلم ہو جائے دوسری طرف فاروقِ اعظمؓ کا مرتبہ لوگوں کی نظروں سے گرانے کی کوشش کی جائے اور تیسرا مقصد یہ تھا کہ جو لوگ فاروقؓ کی عظمت کے قائل ہوں اور انہیں سچا سمجھتے ہوں وہ جان لیں کہ قرآن کی ایک آیت کم ہو گئی اور اگر کوئی یہ مانے کہ قرآن میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی تو اسے یہ ماننا پڑے گا کہ معاذ اللہ حضرت عمرؓ نے جھوٹ بولا تھا اور اپنی طرف سے عربی عبارت بنا کر لائے تھے کہ اسے قرآن میں لکھوا دیں۔ دیکھیں آپ نے عجم کی سازش؟ کیسے چالاک لوگ تھے؟ اور انہوں نے کس معصوم طریقے سے ایسے زہر کو اسلامی لٹریچر کے رگ و ریشہ میں دوڑایا تھا؟ اے اللہ مسلمانوں کو باطل کے چنگل سے بچا اور خصوصاً اس باطل سے جو حق کی نقاب اوڑھ کر سامنے آتا ہے اور اسے پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔

جمع قرآن بعہد عثمانؓ

ابھی ہم جمع قرآن کی اجتماعی تاریخ بیان کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ تاریخ وہ ہے جو روایات سے اخذ کی گئی ہے۔ ساتھ کے ساتھ ہم اپنی تنقید سے ان روایات کا پول بھی کھولتے آ رہے ہیں۔ اب ہم ان روایات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جن میں جمع قرآن بعہد عثمانؓ کی تصریحات آئی ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قرآن مصحف کی شکل میں جمع کر دیا تھا تو پھر حضرت عثمانؓ نے کیا کیا؟ اس کے جواب میں اہل الروایت مختلف خیالات رکھتے ہیں۔ حاکم کا بیان ہے۔

عثمانؓ کے عہد میں سورتوں کی ترتیب ہوئی

"عثمانؓ کے عہد میں سورتوں کی ترتیب ہوئی" (مستدرک۔ الاتقان ج اول)

گویا قرآن حکیم جو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جمع کیا تھا اس میں سورتوں کی ترتیب نہیں ہوئی تھی اور یہی کام رہتا تھا کہ کونسی سورت آگے ہے اور کونسی پیچھے۔ یہ کام حضرت عثمانؓ نے کر دیا۔ یہ خیال بہت لوگوں کا ہے۔ زیادہ تر اس بات کی طرف مائل ہیں کہ عہد عثمانؓ میں اختلافِ قرأت ختم ہوا بخاری شریف میں ہے۔

۱۔ اختلافِ قرأت ختم ہوا

"حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آرمینیہ اور آذربائیجان کی فتح کے موقع پر شامی و عراقی معرکہ آرائی میں شریک تھے وہاں حضرت حذیفہ دونوں ممالک کے مسلمانوں کا اختلافِ قرأت دیکھ کر سخت پریشان ہوئے۔ اس لئے جب آپ حضرت عثمانؓ کے پاس آئے تو انہوں نے کہا، آپ امتِ مسلمہ کی خبر لیجئے۔ کہیں وہ بھی یہود و نصاریٰ کی طرح کتاب اللہ کے معاملے میں مختلف الرائے نہ ہو جائیں۔ حضرت عثمانؓ نے یہ بات سن کر حضرت حفصہؓ کے پاس کہلا بھیجا کہ جو صحائف آپ کے پاس امانتاً رکھے گئے ہیں مجھے بھیج دیجئے۔ میں ان کی نقلیں لے کر واپس کر دوں گا۔ حضرت حفصہؓ نے وہ صحائف حضرت عثمانؓ کو بھیج دئے انہوں نے زیدؓ بن ثابت

عبداللہ بن زبیرؓ۔ سعید بن العاص اور عبدالرحمٰن بن الحارث بن ہشام کو نقول لینے پر مامور کیا۔ اور تینوں قریشی بزرگوں سے کہا کہ جہاں کہیں قرآن کے تلفظ میں زید بن ثابت کے درمیان اختلاف ہو وہاں اس لفظ کو قریش کی ہی زبان میں لکھنا۔ کیونکہ قرآن انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ چنانچہ قریشیوں کی اس جماعت نے مل کر حکم کی تعمیل کی اور جب وہ نقل کر چکے تو اصل صحائف حضرت حفصہؓ کو واپس بھیج دیے گئے اور اپنے لکھوائے ہوئے مصاحف میں سے ایک ایک مصحف ممالک اسلامیہ کے ہر گوشہ میں ارسال کر دیا۔ اور حکم دیا کہ اس مصحف کے سوا اور جس قدر صحائف پہلے کے موجود ہوں انہیں جلا دیا جائے[1] زید کہتے ہیں جس وقت ہم نے مصحف لکھا تو سورۂ احزاب کی ایک آیت ہمیں نہ ملی جو میں نے رسول خدا صلعم سے سنی تھی۔ پھر یہ آیت خزیمہ بن ثابت انصاری کے پاس ملی اور وہ ہے مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ..... الخ چنانچہ ہم نے اس آیت کو سورۂ احزاب میں شامل کر دیا (بخاری باب جمع القرآن)۔

راوی کون ہیں؟ متذکرہ روایت کے راوی ہیں موسیٰ بن اسمٰعیل، ابراہیم بن سعد، ذہبی زہری اور انس بن مالک۔ اس وقت ہم ابراہیم بن سعد کے متعلق ابن حجر کا یہ فقرہ درج کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ فرماتے ہیں

"یہ زہری کی حدیثوں میں بہت ضعیف سمجھے جاتے ہیں" (تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۱۲۲)

اور ابراہیم بن سعد کے بعد کے راوی تو زہری ہیں۔ وہی جانے پہچانے زہری۔

ترمذی کا اضافہ یہی روایت ترمذی نے محمد بن بشار، عبدالرحمٰن بن مہدی، ابراہیم بن سعد اور زہری سے لی ہے۔ مگر آخر میں یہ اضافہ کر دیا ہے کہ

"زہری نے کہا ایک روز کاتبوں میں "تابوت" کے تلفظ میں اختلاف ہوا۔ قریشی "تابوت" کہتے تھے۔ اور حضرت زیدؓ "تابوہ" پر مُصر تھے یہ اختلاف حضرت عثمانؓ کے سامنے پیش ہوا تو انہوں نے فرمایا "تابوت" لکھو کیونکہ قریش کی زبان میں قرآن اترا ہے" (ترمذی)

حضرت صدیقؓ نے تو صرف زید بن ثابت پر اعتماد کیا مگر حضرت عثمانؓ نے ایسا نہ کیا مزید تائیدی روایات نقل کرنے سے پیشتر اس امر پر غور کیجئے کہ حضرت صدیقؓ کے دل میں جب جمع قرآن کا خیال آتا ہے تو وہ صرف حضرت زید بن ثابت پر اعتماد کر لیتے ہیں مگر حضرت عثمانؓ ایسا نہیں کرتے اور پھر جب "تابوت" اور "تابوہ" کے

---

[1] بخاری میں یحرق لکھا ہے جس کے معنی ہیں "جلا دیئے جائیں" لیکن ابن حجرؒ بڑے وثوق سے کہتے ہیں کہ اکثر روایات میں "یخرق" ہے جس کے معنی ہیں باقی صحائف خرقہ کی طرح لپیٹ کر رکھ دیئے جائیں یعنی ان سے کام نہ لیا جائے (فتح الباری ج ۹ ص ۱۱) مگر ابن حجر کا وثوق کیا کرے گا۔ جب ہر تاریخ میں یہ ملے گا کہ باغیوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف جو الزامات لگائے تھے ان میں سرفہرست یہی صحائف جلانے کا الزام تھا۔ نیز یخرق کے معنی پھاڑ ڈالنا بھی تو ہیں ——— سیفی۔

تلفظ میں اختلاف ہو جاتا ہے تو حضرت زیدؓ کا تلفظ غلط ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ حضرت صدیقؓ کے عہد میں جو مصحف جمع کیا گیا تھا اس میں تابوت لکھا گیا تھا یا تابوہ۔ یقیناً تابوہ لکھا ہوگا کیونکہ وہ کیا زیدؓ نے جمع کیا تھا۔ پس اس مصحف میں حضرت عثمانؓ نے تغیر کرا دیا اور پھر زیادہ تعجب خیز امر یہ ہے کہ اس موقع پر زیدؓ کو سورۂ احزاب کی آیت یاد آتی ہے کہ وہ مصحف میں مفقود ہے حالانکہ یہی زید بن ثابت تھے جنہوں نے عہد صدیقیؓ کا مصحف لکھا تھا۔ وہ مصحف پڑھا بھی جاتا تھا مگر کسی کو خیال نہ آیا کہ اس میں ایک آیت نہیں۔ کیا ابوبکرؓ و عمرؓ اس کی تلاوت نہیں کرتے ہوں گے؟ اور قرآن حکیم تو اللہ کے بیان کے مطابق اہل علم کے سینوں میں بھی محفوظ تھا پھر یہ آیت اتنے عرصے تک کیوں کسی کی یاد میں نہ آئی؟

۲۔ اختلافِ قرأت کی تائیدی روایات

اب ہم ایسی روایات نقل کرتے ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں قرآن کی قرأت میں کس قدر شدید اختلافات رونما ہو گئے تھے۔ علامہ ابن اشتہ نے ایوب کے طریق پر ابو قلابہ سے روایت کی ہے کہ:

"مجھ سے انس بن مالک نامی بنی عامر کے ایک شخص نے بیان کیا کہ عثمانؓ کے عہد میں قرآن کے اندر اس قدر اختلافات تھے کہ پڑھنے والوں اور پڑھانے والوں کے درمیان تلوار چل گئی۔ حضرت عثمانؓ کو یہ خبر پہنچی تو انہوں نے فرمایا لوگ میرے سامنے ہی قرآن کو جھٹلانے اور اس میں اس قدر غلطی کرنے لگے ہیں۔ غالباً مجھ سے جو دور ہوں گے ان کا حال بدتر ہوگا۔ اے رسول پاک کے صحابیو! تم جمع ہو جاؤ اور لوگوں کے لئے ایک مصحف لکھو۔ تمام صحابہ نے متفق ہو کر قرآن لکھنا شروع کیا۔ جب کسی آیت کے متعلق اختلاف ہوتا تو وہ کہتے یہ آیت رسول خدا صلعم نے فلاں صحابی کو پڑھائی تھی پھر اسے بلایا جاتا چاہے وہ مدینہ سے تین دن کی مسافت پر بھی کیوں نہ ہوتا۔ جب وہ آتا تو اس سے آیت سنانے کو کہا جاتا۔ وہ سناتا تو اس وقت اس آیت کو لکھ دیا جاتا۔ پہلے اس کی جگہ چھوڑی ہوئی ہوتی"۔ (کتاب المصاحف)

اس روایت سے مندرجہ ذیل امور ایسے معلوم ہوتے ہیں جو پچھلی روایات سے متضاد ہیں۔

(ا) حضرت عثمانؓ نے بخاری کی روایت کے مطابق حضرت زیدؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت سعیدؓ بن عاص۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن حارث کو۔ نقل مصاحف پر مامور نہیں کیا تھا بلکہ تمام صحابہؓ سے اپیل کی تھی۔

(ب) مصحف لکھنے والا کوئی ایک نہ تھا۔ تمام صحابہؓ نے لکھنا شروع کیا نیز حضرت ابوبکرؓ کا جمع کردہ مصحف سامنے نہیں رکھا گیا بلکہ اس روایت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس قسم کا کوئی مصحف موجود ہی نہ تھا۔

(ج) کسی آیت کے خزیمہ بن ثابت کے پاس ملنے کا ذکر نہیں۔

لہ اسے الگ عنوان کے تحت وضاحت سے بیان کیا جائے گا۔ (رفیق)

اب مزید تائیدی روایات ملاحظہ فرمائیے امام ابن ابی داؤد الیوب اور قلابہ کے طریق سے مستنکرہ بالا حدیث نقل کرتے ہیں۔

۳۔ "خلافت عثمانیؓ میں ایک معلم کسی شخص کی قرأت کے مطابق تعلیم دیتا تھا۔ دوسرا کسی اور کی قرأت کے مطابق بچے قرآن پڑھتے اور آپس میں اختلافات کرتے حتیٰ کہ یہ اختلافات معلمین میں بھی اس قدر شدت پکڑ گئے کہ لوگوں نے ایک دوسرے کی قرأت پر کفر کے فتوے صادر کرنا شروع کئے۔ جناب عثمانؓ کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے خطبہ دیا اور فرمایا کہ تم لوگ میرے پاس ہوتے ہوئے بھی قرآن میں اختلاف کرتے ہو اور دوسروں کی تغلیط کرتے ہو۔ جو لوگ مجھ سے دور کے شہروں میں ہیں ان کے اختلافات تو اور بھی شدید ہوں گے۔ اے اصحاب محمدؐ اتفاق سے کام لو اور لوگوں کے لئے ایک متفقہ مصحف تیار کرو۔ ابو قلابہ کہتے ہیں مجھ سے مالک بن انس نے کہا میں ان لوگوں میں شریک تھا جنہوں نے ان کو قرآن لکھایا۔ اگر کسی آیت میں اختلاف ہوتا تو کوئی ایسا آدمی یاد آجاتا جس نے وہ آیت رسول خدا صلعم سے سنی ہوتی اور وہ موجود نہ ہوتا یا کسی دیہات میں ہوتا تو اس آیت کے اگلی پچھلی آیات لکھ لی جاتیں۔ اور اس آیت کی جگہ چھوڑ دی جاتی۔ حتیٰ کہ وہ شخص آجاتا یا اسے بلا لیا جاتا۔ جب مصحف لکھنے سے فراغت ہوئی تو حضرت عثمانؓ نے تمام شہروں میں لکھ بھیجا کہ میں نے یہ کام کیا ہے اور جو کچھ میرے پاس تھا وہ میں نے مٹا دیا ہے۔ تمہارے پاس بھی اگر اس مصحف کے خلاف کچھ ہو تو مٹا دو۔" (کتاب المصاحف)

امام ابن ابی داؤد مصعب بن سعد سے نقل کرتے ہیں کہ

۴۔ "حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو خطاب کیا اور فرمایا! رسول خدا صلعم کو تم سے جدا ہوئے ابھی تیرہ سال ہی گزرے ہیں مگر تم قرآن میں شک کرنے لگ گئے ہو۔ کہتے ہو کہ یہ ابی بن کعب کی قرأت ہے اور یہ عبد اللہ بن مسعود کی (اور دوسروں کو مخاطب کر کے کہتے ہو) خدا کی قسم تیری قرأت ٹھیک نہیں۔ میں تم میں سے ہر شخص پر لازم کرتا ہوں کہ جس شخص کے پاس بھی قرآن میں سے کچھ ہو وہ میرے پاس لائے۔ چنانچہ کوئی کاغذ لاتا کوئی چمڑے کا ٹکڑا۔ جس میں قرآن لکھا ہوتا حتیٰ کہ اس طرح بہت کچھ جمع ہو گیا۔ پھر حضرت عثمانؓ اندر آگئے اور ایک ایک آدمی کو بلا کر قسم دے دے کر انہوں نے پوچھنا شروع کیا کہ کیا تم نے اسے رسول خدا صلعم سے سنا ہے۔ کیا رسول خدا صلعم نے تمہیں یہ کچھ لکھوایا تھا؟ وہ شخص اقرار کرتا۔ حضرت عثمانؓ اس سے فارغ ہو گئے تو لوگوں سے پوچھا تم میں سے بہترین کاتب کون ہے؟ لوگوں نے کہا رسول اللہ صلعم کے کاتب زیدؓ بن ثابت۔ پھر انہوں نے پوچھا تم میں لغت عربی کا ماہر کون ہے؟ لوگوں نے کہا سعید بن العاص۔ حضرت عثمانؓ نے کہا ٹھیک ہے۔ سعید لکھوائیں اور زید لکھیں۔ چنانچہ زیدؓ بن ثابت نے کئی مصاحف لکھے اور ان مصاحف کو حضرت عثمانؓ نے لوگوں میں پھیلا دیا۔" (کتاب المصاحف)

۵۔ یہی امام ابن ابی داؤد انہی مصعب بن سعد سے اسی سے ملتی جلتی ایک اور روایت نقل کرتے ہیں۔

"حضرت عثمانؓ نے ابیؓ بن کعب، عبد اللہؓ بن مسعود اور معاذؓ بن جبل کی قرأتوں کو سنا تو لوگوں کو خطاب کیا۔ ابھی تمہارے نبیؐ کی وفات کو ۱۵ سال ہوئے ہیں اور تم قرآن میں اختلاف کرنے لگے ہو۔ میں ہر شخص پر لازم کرتا ہوں کہ جس کے پاس

قرآن میں سے کچھ ہو جسے اس نے خود حضورؐ سے سنا ہو اسے میرے پاس لائے۔ چنانچہ لوگ لکڑی کی تختیاں ہڈیوں کے ٹکڑے۔ کھجور کی چھالیں لائے جن پر آیات لکھی تھیں۔ جونہی آتا حضرت عثمانؓ اس سے پوچھتے کیا تم نے یہ کچھ رسول صلعم سے سنا ہے۔ پھر انہوں نے لوگوں سے پوچھا تم میں فصیح ترین کون ہے لوگوں نے سعید بن العاص کا نام لیا۔ پھر پوچھا بہترین ماہر کتابت کون شخص ہے؟ لوگوں نے جواب دیا "زید بن ثابت" آپ نے فرمایا اچھا زید لکھیں اور سعید لکھوائیں چنانچہ کئی مصاحف لکھے گئے۔ اور انہیں مختلف شہروں میں تقسیم کر دیا گیا۔ (کتاب المصاحف)

ان دونوں روایات میں تیرہ سال اور پندرہ سال کا جو اختلاف آیا ہے بڑا واضح ہے اور پھر لطف یہ کہ دونوں روایتوں کا راوی ایک ہی ہے۔ یعنی مصعب بن سعد۔ اس فرق کو ذہن میں رکھیے اور آگے چلئے۔

امام ابن ابی داؤد مذکور محمدؒ سے نقل کرتے ہیں۔ صرف محمدؒ لکھا گیا ہے بعض نے اسے محمد بن سیرین سمجھا ہے اور اکثر نے محمد بن ابی گمان کیا ہے بہرحال جو صاحب بھی ہوں فرماتے ہیں۔

۴۔ "لوگ قرآن پڑھتے تھے اور نوبت یہاں تک آگئی تھی کہ ایک آدمی دوسرے کو کہتا جو کچھ تو پڑھتا ہے اس سے تو کافر ہوا اس کی اطلاع حضرت عثمانؓ کو ہوئی تو انہیں یہ بات بڑی گراں گزری انہوں نے قریش اور انصار کے ۱۲ آدمیوں کو جمع کیا۔ جن میں ابی بن کعب اور زید بن ثابت تھے۔ اور انہیں حضرت عمرؓ کے مکان کے صحن میں جمع کیا۔ حضرت عثمانؓ بھی ان کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ محمدؒ (ابن ابی یا ابن سیرین) کہتے ہیں کہ مجھ سے کثیر بن افلح نے بیان کیا جو ان لوگوں کے لئے قرآن لکھنے والوں میں سے ایک تھے کہ اکثر ان بارہ آدمیوں میں اختلافات ہو جاتا تھا تو اس اختلافی آیت کو مؤخر کر دیتے تھے۔ محمدؒ کہتے ہیں میں نے پوچھا آپ لوگ کیوں اسے مؤخر کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا مجھے معلوم نہیں۔ محمدؒ کہتے ہیں میرا گمان ہے تم نے یقین نہ بنا لینا کہ اختلافی آیت کو وہ اس لئے مؤخر کرتے تھے کہ اگر کوئی ایسا آدمی مل گیا جو حضورؐ کے آخری دور میں شریک رہا ہو تو اس سے پوچھ کر لکھیں گے۔" (کتاب المصاحف)

(دوسری قسط آئندہ شمارہ میں ملاحظہ فرمائیے۔)

قارئینِ "المنبر" سے

اگرچہ ملک بھر کے تمام اہم اخبارات میں یہ خبر شائع ہو چکی ہے کہ ہفت روزہ "المنبر" لائل پور ——— چھ ماہ کے لئے بند کر دیا گیا ہے۔ بایں ہمہ قارئین المنبر کی جانب سے مسلسل خطوط موصول ہو رہے ہیں کہ المنبر نہیں مل رہا۔ ہم اس پابندی کو اٹھوانے کے لئے آئینی حدود کے اندر کوشاں ہیں۔ جونہی یہ پابندی رفع ہوئی "المنبر" حسب سابق معرضِ کار ہو جائے گا۔ انشاء اللہ العزیز۔

(مینجر ہفت روزہ "المنبر" لاہور)

باب المراسلات

۱۔ مسلمانوں کے حرم

ایک صالح نوجوان جو حال ہی میں یورپ اور امریکہ وغیرہ کے سفر سے واپس آئے ہیں، ایک نہایت نازک سوال دریافت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ مغربی ممالک میں جہاں بھی پہنچا اس سے سب سے پہلا سوال یہ کیا گیا کہ تمہارے "حرم" کتنے ہیں۔ "حرم" سے ان کی مراد ہوتی ہے، بیویوں کا ریوڑ اور لونڈیوں کی پوری کھیپ۔ اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کے متعلق ان کا احساس یہ ہے کہ ان میں من حیث القوم جنسی جذبہ بڑا قوی اور شدید ہوتا ہے۔ اور بدقسمتی سے ہماری تاریخ خود اس کی شہادت بہم پہنچاتی ہے —— خواہ وہ پچھلی تاریخ ہو یا خود ہمارے زمانے کی تاریخ۔ قرآن شریف نے زنا کی سخت سزا مقرر کی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہم میں زنا ایسا عام ہے بھی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمان اس معاملہ میں بڑا بدنام ہے۔ یورپ میں آج کل جنسی جذبہ کی جو شدت پائی جاتی ہے اس کی وجہ ظاہر ہے کہ وہاں زنا کو (سوائے بالجبر کے) معیوب ہی خیال نہیں کیا جاتا۔ لیکن جس قوم میں زنا کو اس قدر معیوب خیال کیا جاتا ہو ان میں جنسی جذبہ کی شدت کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ کیا آپ بتائیں گے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟

طلوع اسلام

جنسی جذبہ کے متعلق سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ بھوک یا پیاس کی طرح از خود بیدار نہیں ہوتا۔ اسے انسان اپنے خیالات سے بیدار کرتا ہے اور اس کے لئے جس قدر زیادہ مواقع ممکن نظر آئیں اسی قدر زیادہ خیال اس کی طرف جاتا ہے۔ اور اسی نسبت سے یہ زیادہ شدت سے بیدار بھی ہوتا ہے —— سوال جائز یا ناجائز کا نہیں۔ نفسیاتی طور پر سوال مواقع (OPPORTUNITIES) کے کم یا زیادہ ہونے کا ہے۔

آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ جس حلقہ کو محارم (PROHIBITED AREA) تصور کر لیا جاتا ہے (یعنی جن عورتوں یا مردوں سے نکاح حرام ہوتا ہے) اس میں جنسی جذبہ کا خیال تک بھی نہیں آتا۔ بیٹی۔ بہن۔ خالہ۔ پھوپھی وغیرہ کے حلقہ میں انسان دن رات پھرتا ہے لیکن جنسی جذبہ کا تصور تک بھی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن کریم نے زنا کو سنگین ترین جرم اور معیوب ترین حرکت قرار دینے کے بعد دوسرا قدم یہ اٹھایا تھا کہ محارم کا دائرہ بہت وسیع کر دیا تھا۔ مثلاً مسلمان مردوں کے لئے تمام غیر مسلم عورتیں (بجز اہل کتاب کی عورتوں کے) محرمات کی فہرست میں داخل۔ اور مسلمان عورتوں کے لئے تمام غیر مسلم مرد محارم کے دائرے کے اندر۔ آپ غور کیجئے کہ مسلمان مرد، کفار اور مشرکین کی عورتوں کے اژدحام میں دن رات پھرتا ہے۔ چونکہ ان سے نکاح حرام ہے اس لئے اس کے دل میں ان کی طرف سے جنسی جذبہ کا خیال تک نہیں آئے گا۔ وہ سب اس کے نزدیک۔ ماؤں۔ بہنوں۔ بیٹیوں کے برابر ہوں گی۔ قرآن کریم نے اس ایک حکم سے ان غیر مسلم عورتوں کو مسلمانوں کی طرف سے کس طرح یکسر محفوظ اور مامون کر دیا کہ یہ ان کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے۔ اسی طرح مسلمان عورتوں کے نزدیک دنیا کے تمام غیر مسلم مرد بھائیوں اور بیٹوں کی مانند ہوں گے۔

اب لیجئے وہ حلقہ جس کے اندر نکاح ہو سکتا ہے۔ اس میں قرآن کریم نے وحدت زوج (MONOGAMY) کو عام اصول قرار دے کر شادی کے بعد دنیا بھر کی عورتوں کو محرمات کی فہرست میں داخل کر دیا۔ یعنی جب ایک شخص نے کسی عورت سے نکاح کر لیا تو چونکہ اس کی موجودگی میں وہ (بجز ہنگامی حالات کے) کسی دوسری عورت سے شادی نہیں کر سکتا۔ اس لئے جب تک وہ عورت زندہ یا اس کے نکاح میں ہے۔ دنیا کی تمام عورتیں اس پر حرام ہو گئیں۔ اسی طرح وہ مرد بھی باقی تمام عورتوں کے نزدیک باپ اور بیٹے کی طرح ہو گیا۔ اسے کسی اور عورت سے' یا کسی عورت کو اس سے شادی کا خیال اسی وقت آ سکتا ہے جب اس کی پہلی بیوی مر جائے یا ان میں طلاق ہو جائے۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم نے جنسی جذبہ کی تسکین کے مواقع کو کم از کم حد تک سکیڑ کر کس طرح اس جذبہ کی بیداری کے نفسیاتی محرکات کو سمٹا دیا۔ زنا حرام — اور ایک عورت سے شادی کر لینے کے بعد اس کی موجودگی میں دنیا کی ہر عورت سے نکاح ناجائز (بجز ان خصوصی حالات کے جن کا ذکر آگے چل کر آتا ہے)۔ یہ سب محرمات کی صف میں چلی گئیں۔ اسی طرح تمام شادی شدہ مسلمان مرد دنیا بھر کی عورتوں کے نزدیک محارم کی صف میں آ گئے۔

لیکن مسلمانوں نے کیا کیا؟ زنا کو تو حرام سمجھا لیکن جنسی جذبہ کی تسکین کے مواقع کو زیادہ سے زیادہ عام کر دیا۔ قرآن کریم نے ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی کی اجازت صرف ان استثنائی صورتوں میں دی تھی جب

معاشرہ میں عورتوں اور یتیم بچوں کی کفالت اور حفاظت کا سوال ایک لاینحل مسئلہ بن جائے۔ انہوں نے اسے عام اجازت قرار دے کر شادی ہو جانے کے بعد بھی، باقیماندہ عورتوں کو محرم نہ رہنے دیا۔ نہ ہی باقی عورتوں نے اس مرد کو محرم سمجھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہر عورت کو اس کی چھٹی مل گئی کہ وہ جس عورت کا خیال چاہے جی میں لے آئے اور سوچتا رہے کہ اس سے شادی کی کیا صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ہر عورت یہ خیال کرتی رہے کہ اس کے نکاح میں جانے کی کیا شکل پیدا ہو سکتی ہے۔ چونکہ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) جنسی جذبہ کی بیداری خیالات سے ہوتی ہے اس لئے اس قوم میں اس جذبہ کی مسلسل بیداری کی راہیں کھل گئیں ـــــ پھر چونکہ مرد کو اس کا بھی اختیار مطلق دے دیا گیا کہ وہ جس وقت جی چاہے بغیر کوئی وجہ بتائے، بیوی کو طلاق دے سکتا ہے۔ اس لئے چار تک کی تحدید بھی اس راستے میں حائل نہ ہو سکی۔ چار بیویوں کے بعد بھی اس کے لئے اور عورتوں سے نکاح کرنے کا راستہ کھول دیا گیا ـــ یعنی ایک کو طلاق دے کر اس کی جگہ دوسری بیوی لے آنے سے ـــــ اس سے آگے بڑھے تو لونڈیوں کو حرم میں داخل کرنے لگے۔ حالانکہ قرآن کریم نے غلاموں اور لونڈیوں کا تصور تک مٹا دیا تھا کبھی دشمن کی قید کردہ عورتیں بطور لونڈیاں اور کبھی بازار میں بکتی ہوئی عورتیں ـــ اور چونکہ لونڈیوں کی تعداد پر بھی حد بندی نہ تھی اس لئے اس سے جنسی جذبہ کے اشتعال کی جو صورت پیدا ہو سکتی تھی وہ ظاہر ہے۔

یہ ہیں وہ وجوہات جن کی بنا پر بدقسمتی سے ہماری قوم میں جنسی جذبہ کی بیداری اس افراط اور شدت سے پائی جاتی ہے۔ آپ زنا اور مبادیاتِ زنا کو جرم اور معیوب حرکات قرار دے کر وحدتِ زوج کے قانون کو (بجز ہنگامی حالات کے) اصول بنا دیں۔ اس کے بعد دیکھیں کہ جنسی جذبات میں کس قدر سکون اور اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔ اور معاشرہ میں عام عورتوں اور مردوں کے تعلقات کا وہ مسئلہ جس نے اس وقت قوم کو اس قدر مضطرب و پریشان کر رکھا ہے اس کا حل بھی کس طرح خود بخود مل جاتا ہے۔ مسلمان مرد کے ہاتھوں تو دنیا کی ہر عورت اپنے آپ کو سب سے زیادہ محفوظ تصور کر سکتی ہے۔ اگر وہ شادی شدہ نہیں تو وہ اس کی طرف بری نگاہ سے دیکھ نہیں سکتا کیونکہ زنا اور مبادیاتِ زنا اس کے نزدیک انتہائی معیوب افعال اور جرائم ہیں اور اگر وہ شادی شدہ ہے تو جب تک اس کی بیوی موجود ہے وہ عام حالات میں کسی عورت کے متعلق جنسی خیال تک بھی دل میں نہیں لا سکتا۔ یہ سب محرمات کی صف میں داخل ہیں۔

جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک سمیٹ دینے سے اتنا ہی نہیں ہوتا کہ معاشرہ میں سکون پیدا ہو جاتا ہے بلکہ یہ قوم زندگی کی خوشگواریوں میں زیادہ سے زیادہ آگے بڑھ جاتی ہے۔ مغرب کا مشہور ماہر جنسیات (DR. UNWIN) اس ضمن میں لکھتا ہے۔

کسی سوسائٹی میں تخلیقی توانائیاں باقی نہیں رہ سکتیں جب تک اس کی ہر نسل ان روایات میں پرورش نہ پائے جو جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک محدود نہ کردیں۔ اگر وہ قوم اس قسم کے نظام کو (جس میں جنسی اختلاط کے مواقع کو قلیل ترین حد تک محدود کردیا جائے) مسلسل آگے بڑھاتی جائے تو وہ شاندار روایات کی حامل بن جائے گی۔

۲۔ یادگاریں

سوال۔ دنیا میں بھی عام رواج ہے اور ہمارے ہاں بھی اب اس کی طرح پڑ رہی ہے کہ مشاہیر یا بڑے بڑے واقعات کی یادگاریں تعمیر کی جائیں۔ قرآن شریف کا اس باب میں کیا فیصلہ ہے؟

جواب۔ اگر کسی شخص نے نوعِ انسان کی منفعت بخشی کا کوئی بڑا کام سرانجام دیا ہے تو اس کی یادگار اس کے اس عظیم کام کی یاددہانی کا ذریعہ ہوتی ہے تاکہ اس سے آنے والی نسلوں کے دل میں اسی قسم کے کام کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔ اس مقصد کے پیشِ نظر اس قسم کی یادگار قائم کرنا مفید ہوتا ہے۔ جو یادگاریں نظامِ خداوندی کے قیام و استحکام سے متعلق ہوں قرآن نے انہیں شعائر اللہ کہہ کر پکارا ہے۔ اسی طرح ایسے عظیم واقعات جو اس سلسلہ میں رونما ہوں ان کی یاد قائم رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ انہیں قرآن کریم نے ایام اللہ سے تعبیر کیا ہے۔ اور ان کی یاددہانی بھی ضروری قرار دی ہے۔ چنانچہ فرعون اور حضرت موسیٰؑ کی آویزش کے سلسلہ میں کہا ہے وَذَكِّرْهُم بِأَيَّامِ اللَّهِ (۱۴/۵) انہیں ایام اللہ کی یاد دلاؤ۔ اگر اس قسم کے اہم واقعات کی یاد کے لئے کوئی عمارت تعمیر کی جاتی ہے تو وہ بھی مفید نتائج پیدا کرتی ہے۔

لیکن اس سلسلے میں ایک بنیادی اصول کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ یادگار ایسی ہونی چاہیئے جو لوگوں کو فائدہ پہنچائے۔ محض ایک ستون کھڑا کر دینا یا مینار بنا دینا جس کی افادی حیثیت کچھ نہ ہو، اسراف بیجا ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت ہودؑ نے قومِ عاد کی غلط کاریوں کی جو فہرست پیش کی تھی اس میں یہ بھی تھا کہ أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ ——— (۲۶/۱۲۸) تم اونچے اونچے مقامات پر ایسی یادگاریں تعمیر کرتے ہو جن کا مصرف کوئی نہیں ہوتا۔ وہ بے کار عمارت ہوتی ہے۔ تعبثون (ع۔ب۔ث) سے ہے جس کے معنی بے کار، بے غرض و غایت۔ بے مطلب یعنی عبث ہیں۔ ہم نے ہندوستان میں صدیوں تک حکومت کی۔ لیکن غور کیجئے کہ اس ملک میں بڑے بڑے عظیم الشان مقبروں کے علاوہ اس دورِ حکومت کی یادگار کیا ہے۔ ان مقبروں پر کروڑوں روپے صرف آ گئے ہیں۔ لیکن سوچئے کہ ان کی (خواہ اس وقت جب وہ تعمیر کئے گئے تھے۔ یا آج) افادی حیثیت کیا ہے؟ وہ سب بیکار عمارتیں ہیں۔ ان کے برعکس (مثلاً)

سرسیدؒ کی یادگار (علی گڑھ کالج) کو دیکھئے ــــ علوم و فنون کا ایک چشمہ جاریہ ہے، جس کے ایک گوشے میں اس کے بانی کی سادہ سی قبر ہے۔ جو کچھ کالج کی عمارت پر صرف کیا تھا اگر اس سے سرسیدؒ کا عالیشان مقبرہ بنا دیا جاتا تو سوچئے کہ وہ سرسیدؒ کی بہتر یادگار ہوتی یا کالج بہتر یادگار ہے۔

ہم اتنا اور واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ جب ہم نے کہا ہے کہ ان عمارات کی افادی حیثیت ضرور ہونی چاہیئے تو اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ان میں جمالیاتی پہلو نہیں ہونا چاہیئے۔ جمالیاتی پہلو تو انسانی زندگی کی تاریک راتوں کے لئے چاندنی ہے۔ اسے کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تو اس کے ساتھ افادی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی کے لئے دونوں کا امتزاج ضروری ہے۔ بہرحال یادگار ایسی ہونی چاہیئے جو منفعت بخش اور جمال آفرینی کی جوئے رواں ہو۔ نہ کہ عبث و بیکار عظمت۔

۳۔ شریف زادیوں سے چھیڑ چھاڑ

سابقہ فروری کے طلوع اسلام میں ہم نے ایک محترمہ خاتون کا خط شائع کیا تھا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ آج کل ہمارے ہاں یہ وبا عام ہو رہی ہے کہ قوم کے نوجوان لڑکے گزرگاہوں پر شریف زادیوں کو تنگ کرتے ہیں۔ ہم نے اس پر انتہائی رنج و تاسف کا اظہار کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اس کا علاج یہ ہے کہ اس قسم کے بد تہذیب، فتنہ پرور لوگوں کو عبرت آموز سزائیں دی جائیں۔ اس پر ہمیں (بزعم خویش) "دیندار" طبقہ کی طرف سے کئی ایک خطوط موصول ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

> طلوع اسلام ملک میں بے حیائی پھیلانے کا ٹھیکیدار بن گیا ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ ان عورتوں اور جوان لڑکیوں سے کہتا کہ تم گھروں سے باہر کیوں نکلتی ہو۔ اندر کیوں نہیں بیٹھتیں۔ اس نے الٹا ان لڑکوں کو کوسنا شروع کر دیا اور اس طرح ان باہر پھرنے والیوں کی اور حوصلہ افزائی کر دی۔ (وغیرہ وغیرہ)

ہم اپنے ان بھائیوں کی خدمت میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ طلوع اسلام نے جو کچھ کہا تھا اپنی طرف سے نہیں کہا تھا۔ خدا کا حکم پیش کیا تھا۔ خدا نے رسول اللہ سے کہا تھا کہ ان فتنہ پرور منافقین کی اتمام حجت کے لئے اپنی عورتوں سے تو یہ کہہ دو کہ وہ اپنے اوپر ایک کپڑا اوڑھ لیا کریں تاکہ یہ لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہم پہچان نہیں سکے تھے کہ عورت آوارہ ہے یا شریف زادی۔ اور اگر اس کے بعد یہ ان حرکات سے باز نہ آئیں تو انہیں سخت سزائیں دی جائیں۔ جن میں سزائے قتل بھی شامل ہے (دیکھئے ۳۳/۵۹-۶۰)۔ افسوس ہے کہ ہمارے یہ معترض حضرات نزول قرآن کے وقت موجود نہ تھے ورنہ یہ ضرور اللہ میاں سے کہتے کہ معاذ اللہ، "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس سے تو یہ عورتیں اور بیباک

ہو جائیں گی۔ آپ ان سے کہئے کہ یہ گھروں سے باہر نہ نکلا کریں۔ اور ان چھیڑ چھاڑ کرنے والوں سے کہئے کہ شاباش! تم بہت بڑا کام کر رہے ہو۔ اگر یہ عورتیں پھر باہر نکلیں تو انہیں ایسا تنگ کرو کہ دوبارہ باہر آنے کا نام نہ لیں۔ اس کارِ خیر کا بہت بڑا اجر تمہارے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا۔" اسی قسم کا وہ طبقہ تھا جو رسول اللہ سے کہا کرتا تھا کہ ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ (۱۰/۱۵)۔ یہ قرآن ہماری منشا کے مطابق تعلیم نہیں دیتا۔ اس کی جگہ کوئی دوسرا قرآن لاؤ۔ یا اس کے فلاں فلاں مقام میں ہماری حسبِ منشا رتبدیلی کر دو۔ پھر ہم اسے مانیں گے۔ طلوعِ اسلام کا قصور اتنا ہی ہے کہ یہ قرآن کریم کو اس کی اصلی شکل میں پیش کرتا ہے۔ قرآن کا وہ مفہوم پیش نہیں کرتا جو لوگوں کی منشا کے مطابق وضع کیا گیا ہو۔ واضح رہے کہ عورتوں کو گھروں میں بند رکھنا، قرآن کریم نے ایک جرم کی سزا کے طور پر تجویز کیا ہے۔ (۴/۱۵)۔ اگر مقصد یہ ہوتا کہ عورتیں گھروں سے باہر ہی نہ نکلیں تو یہ کیوں کہا جاتا کہ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ اور قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ (۲۴/۳۰-۳۱)۔ مومن مردوں اور عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں۔ وہ جو سورۂ احزاب میں "نبی کی عورتوں" سے کہا گیا ہے کہ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ۔ اپنے گھروں میں وقار سے بیٹھیں۔ تو اس سے مراد یہ نہیں کہ وہ گھروں میں بند رہیں۔ باہر نکلیں ہی نہیں۔ ان الفاظ کی تشریح اگلے الفاظ نے کر دی، جہاں کہا گیا کہ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى۔ (۳۳/۳۳)۔ جس طرح زمانۂ جاہلیت میں عورتوں کا حال تھا کہ وہ مردوں کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے اپنی آرائش و زیبائش کی نمود و نمائش کرتی پھرتی تھیں۔ وہ کچھ نہ کریں۔ لہٰذا قرآن کریم کی رو سے۔

(۱) عورتوں کو یہ حکم نہیں دیا گیا کہ وہ گھروں کے اندر بند رہیں۔ پابندِ مسکن رکھنا تو ایک جرم کی سزا ہے۔

(۲) وہ کام کاج کیلئے مردوں کی طرح باہر آ جا سکتی ہیں۔ البتہ انہیں اس سے روکا گیا ہے کہ وہ زیب و زینت کی نمائش یا حسن کی نمود کرتی پھریں۔

(۳) عورتوں کو چھیڑنا اور تنگ کرنا سنگین جرم ہے۔ معاشرہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسا کرنے والوں کو اس سے روکے اور اگر وہ اپنی حرکات سے باز نہ آئیں تو انہیں سخت ترین سزا دے۔

۳- ایک آیت کا صحیح مطلب

سوال -

احادیث کی اطاعت کو حکمِ خداوندی قرار دینے والوں کی طرف سے اکثر یہ آیت پیش کی جاتی ہے۔ وَمَآ اٰتٰىكُمُ

الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (۵۹:۷)۔ "جو کچھ رسول تمہیں دے اسے لو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ۔ اس کا صحیح مطلب واضح کر دیجئے۔

جواب۔

ہم اس وقت اس بحث میں الجھے بغیر کہ حدیث کی صحیح پوزیشن کیا ہے، اور اطاعت رسولؐ کس طرح کی جاتی ہے اپنے آپ کو صرف اس آیت کا صحیح مفہوم بیان کرنے تک محدود رکھیں گے۔ اسے پیش نظر رکھئے۔

اس آیت کا ہمیشہ اتنا ہی حصہ پیش کیا جاتا ہے جتنا آپ نے نقل فرمایا ہے اور یہ اسی قبیل کی مثال ہے جس طرح کہا جاتا ہے کہ قرآن میں ہے۔ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ "تم نماز کے قریب مت جاؤ" اور اس کے بعد کا حصہ — وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى (۴:۴۳) کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یا جس طرح چار بیویوں کے جواز میں — وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی۔ کو چھوڑ کر فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ (۴:۳) کے الفاظ دہرائے چلے جاتے ہیں۔ جس آیت (۵۹:۷) کا ایک حصہ آپ نے نقل کیا ہے وہ پوری آیت یوں ہے۔

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى
وَالْيَتٰمٰى وَابْنِ السَّبِيْلِ ۔ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ۔
وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ۔
اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۵۹:۷)۔

اس کا ترجمہ مولانا محمود الحسنؒ نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

جو مال لوٹایا اللہ نے اپنے رسول پر بستیوں والوں سے سو اللہ کے واسطے اور رسول کے اور قرابت والے کے۔ اور یتیموں اور محتاجوں کے اور مسافر کے تاکہ نہ آئے لینے دینے میں دولت مندوں کے تم میں سے۔ اور جو تم کو رسول دے سو لے لو اور جس سے منع کرے سو چھوڑ دو۔ اور ڈرتے رہو اللہ سے۔ بے شک اللہ کا عذاب سخت ہے۔

یہ آیت اپنے مطلب کی وضاحت کے لئے واضح اور خود مکتفی ہے۔ یعنی اس کا تعلق اس مال کی تقسیم سے ہے جو بطور فے حاصل ہوا تھا۔ اس کے متعلق فرمایا کہ اس کی تقسیم رسول اللہؐ کی صوابدید کے مطابق ہوگی۔ وہ جسے جتنا دیں اسے چاہیئے کہ اتنے پر راضی ہو جائے۔ جو کسی کو نہ دیں اس کے لینے کا وہ خیال تک بھی اپنے دل میں نہ لائے۔ چنانچہ مولانا محمود الحسنؒ کے ترجمہ کے بعد حاشیے پر لکھا ہے۔ "یعنی مال و جائداد وغیرہ جس طرح پیغمبر اللہ کے حکم سے تقسیم کرے اسے بخوشی و رغبت قبول کرو۔ جو ملے لے لو۔ جس سے روکا جائے رک جاؤ۔"

وہ بات کیا تھی جس کے لئے ایسا کہنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس کی وضاحت سورۂ توبہ میں کر دی گئی ہے۔ جہاں کہا گیا کہ وَمِنْهُم مَّن يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ۔ اور بعض ان میں سے وہ بھی ہیں جو صدقات بانٹنے کے معاملہ میں تیرے خلاف الزامات لگاتے ہیں۔ اور طعن کرتے ہیں۔ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا وَإِن لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ۔ اگر انہیں اس میں سے کچھ مل جائے تو راضی ہو جاتے ہیں اور اگر نہ ملے تو ناراض ہو جاتے ہیں وَلَوْ أَنَّهُمْ رَضُوا مَا آتَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ سَيُؤْتِينَا اللَّهُ مِن فَضْلِهِ وَرَسُولُهُ (۹:۵۸-۵۹) کیا اچھا ہوتا اگر وہ راضی ہو جاتے اس پر جو انہیں خدا اور اس کے رسول نے دیا تھا۔ اور کہتے کہ کافی ہے ہمارے لئے اللہ اور اس کا رسول۔ ہمیں اپنے فضل سے دے گا۔ ہم (دل وجان سے) خدا کی طرف راغب ہوتے ہیں۔" اس کے حاشیے پر لکھا ہے "بہترین طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ خدا، پیغمبر کے ہاتھ سے دلوائے اس پر آدمی راضی اور قانع ہو۔" آپ نے غور کیا کہ ان دونوں آیتوں میں بات تقسیم مال کے متعلق ہو رہی ہے۔ حتیٰ کہ دونوں جگہ الفاظ بھی ایک جیسے ہیں۔ سورۂ حشر میں مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ ہے اور سورۂ توبہ میں مَا آتَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ ہے۔ لہٰذا سورۂ حشر کی آیت کے اتنے سے حصے کو پیش کر کے یہ کہنا کہ دیکھو! خدا کا حکم ہے کہ تم احادیثِ رسول اللہ پر عمل کرو۔ قرآن کریم کو اپنا مفہوم پہنانا ہے۔ ہمارا مطلب یہ نہیں کہ قرآن کریم میں اطاعتِ رسول کا حکم نہیں۔ اس کے لئے اس میں بہت سی آیات ہیں۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ اس ضمن میں سورۂ حشر کی آیت کا جو حصہ باقی ماندہ آیت سے الگ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ اور اس سے مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ خدا کا ارشاد ہے کہ تم تمام احادیث کی اطاعت کرو، ——— یہ صحیح نہیں۔ اس آیت کا تعلق مالِ فے کی تقسیم کے ایک واقعہ سے ہے۔ اور اگر پوری آیت سامنے لائی جائے تو اس سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

۵۔ مسلم اور مومن میں فرق

سوال۔ کیا قرآن شریف کی رُو سے مسلم اور مومن میں کوئی فرق ہے یا دونوں کا مطلب ایک ہی ہے۔ لفظ "مسلمان" تو قرآن شریف میں کہیں نہیں آیا۔

جواب۔

یہ ٹھیک ہے کہ "مسلمان" کا لفظ قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا۔ جہاں تک مسلم اور مومن کا تعلق ہے قرآن کریم نے ان الفاظ کو بالعموم مترادف معانی میں استعمال کیا ہے۔ اور ان دونوں میں فرق نہیں کیا۔ لیکن ایک مقام ایسا ہے جس میں ان دونوں میں فرق بھی کیا گیا ہے۔ اور وہ مقام بڑا اہم ہے۔ بالخصوص ہماری موجودہ حالت کے پیشِ نظر۔ جب مدینہ میں اسلامی مملکت قائم ہوئی تو بہت سے بدوی قبائل (اعراب) اس سے متاثر ہو کر اسلام لے آئے۔

اور اپنے آپ کو مومن سمجھنے لگ گئے۔ قرآن کریم نے اس کے متعلق کہا قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا۔ یہ بدوی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا ــــ ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے۔ تمہیں یہ کہنا چاہیئے کہ ہم نے اطاعت اختیار کرلی ہے (ہم "تسلم" ہو گئے ہیں) انگریزی زبان میں اسے کہیں گے۔ (WE HAVE SUBMITTED) اس لئے کہ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (۴۹/۱۴) ابھی ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔ اس سے مسلم (مسلمان) اور مومن میں فرق سامنے آگیا۔ مومن تو وہ ہیں جو دل و دماغ کی کامل رضامندی سے، بغیر کسی اور جذبہ اور خیال کے، اس دین (نظام خداوندی) کی صداقت پر یقین کامل رکھیں۔ اور پھر صحیح تعلیم و تربیت سے ان کی کیفیت یہ ہو جائے کہ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنا خود ان کا قلبی تقاضا بن جائے۔ وہ ان کے لئے خارج سے عائد شدہ احکام کی پابندی نہ ہو، بلکہ ان کے اندرونی تقاضے کی تسکین کا سامان ہو۔ جس طرح پیاس میں پانی پینا کسی کے حکم کی اطاعت نہیں ہوتی۔ اپنے اندرونی تقاضے کی تسکین ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ جماعت جس کے ہاتھوں نظام خداوندی کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور جو اس کے قیام اور استحکام کے اولیں ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس کے بعد بعض اور لوگ اس نظام میں داخل ہوتے ہیں جن کے متعلق یوں سمجھئے کہ وہ اپنے آپ کو (SURRENDER) کر دیتے ہیں۔ یہ (SURRENDER) کرنا ضروری نہیں کہ میدان جنگ ہی میں ہو۔ اس کی اور صورتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ یہ اس نظام کا نظریہ بھی قبول کر لیتے ہیں۔ (اسے ایمان لانا یا مسلمان ہونا کہتے ہیں) اور اس کے احکام کی اطاعت بھی کرتے ہیں لیکن وہ اطاعت، قانون (حکومت) کی رُو سے کرتے ہیں۔ وہ ان کے دل کی پکار نہیں ہوتی۔ ان میں دو قسم کے لوگ ہو سکتے ہیں۔ ایک تو وہ جو محض کسی مصلحت کی بنا پر دکھاوے کے لئے اس نظام میں داخل ہو جائیں۔ انہیں منافقین کہا جائے گا۔ اور دوسرے وہ جو اس نظریۂ زندگی کو قبول تو کر لیں لیکن محض ذہنی طور پر۔ انہیں منافق نہیں کہا جائے گا لیکن ہو سکتا ہے کہ ان کے دل میں اس نظریۂ حیات اور نظام زندگی کی طرف سے شکوک و شبہات ابھریں۔ یہ اگر اس نظام کی اطاعت کرتے رہیں اور ان کی ضروری تعلیم و تربیت ہوتی رہے تو ان میں سے رفتہ رفتہ مومنین کے زمرے میں داخل ہوتے جائینگے۔ اس لئے قرآن کریم نے ان اعراب کے متعلق جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، کہا کہ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۴۹/۱۴)۔ اگر تم اس نظام خداوندی کی اطاعت کرتے رہے تو تمہارے اعمال کے نتائج میں سے کچھ کم نہیں کیا جائے گا۔ اس سے یہ ہو جائے گا کہ تم میں جو کمی رہ گئی تھی اس کے مضر نتائج سے تمہاری حفاظت ہو جائے۔ اور اس کے ساتھ تمہاری ذات کی نشوونما بھی ہوتی چلی جائے اور یوں تم مومنین کے زمرہ میں شامل ہو جاؤ۔ اس لئے کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا۔ مومن وہ ہوتے ہیں جو (دل و دماغ کے کامل اطمینان کے بعد) اللہ اور رسول پر ایمان

لاتے ہیں اور پھر اس نظریہ زندگی کے متعلق ان کے دل میں کوئی شک وشبہ پیدا نہیں ہوتا۔ وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ اور اس نظام کے قیام واستحکام کی خاطر اپنے جان اور مال سے مسلسل جہد کرتے رہتے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ـــــ (۴۹/۱۵) یہ لوگ ہیں جو اپنے دعوئے ایمان میں سچے اور مومن کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں۔ ان کے برعکس جنہیں (اعراب کے انداز کلام مسلم کہا گیا ہے ان کے متعلق کہا کہ قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ۔ ان سے کہو کہ کیا تم اللہ کو اپنی دینداری جتلاتے ہو؟ آپ نے غور کیا کہ اس سے ان کی اطاعت وفرماں پذیری کی صحیح کیفیت کس طرح نمایاں طور پر سامنے آجاتی ہے؟ یعنی یہ اطاعت ان کے دل کا تقاضا نہیں ہوتی۔ وہ دین کی خاطر کچھ کرتے ہیں تو اسے جتلاتے ہیں۔ (گویا کہ ان سے کہہ دو کہ تمہارے جتلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ تم کیا ہو اور کیا کرتے ہو اس لئے کہ) وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ۔ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ـــــ اللہ کائنات کی ہر شے سے خوب واقف ہے۔

اس کے بعد ان کی ایک اور نفسیاتی کیفیت سامنے آتی ہے کہ يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ـــ اے رسول! یہ لوگ تم پر احسان دھرتے ہیں کہ یہ لوگ اسلام لے آئے ہیں قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ۔ ان سے کہو کہ اپنے اسلام کا احسان مت رکھو۔ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ۔ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ (۴۹/۱۷) اگر واقعی سچے دل سے مسلمان ہوئے ہو تو تمہیں اس کا احساس ہونا چاہیئے کہ یہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں زندگی کا صحیح راستہ دکھا دیا۔

قرآن کریم کی ان تصریحات سے مسلم اور مومن کا فرق سامنے آگیا۔ دورِ حاضر کی سیاسی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ اسلامی مملکت (نظامِ خداوندی) میں تین قسم کے شہری (CITIZENS) ہوں گے۔

(۱) غیر مسلم۔ یعنی جنہوں نے اسلام کے نظریۂ زندگی کو قبول نہ کیا ہو۔ ان کی حفاظت ہر طرح سے ہوگی۔ لیکن انہیں پورے حقوقِ شہریت حاصل نہیں ہوں گے۔ یوں کہئے کہ یہ (NATURAL CITIZENS) ہوں گے۔

(۲) مسلم۔ جنہوں نے اسلامی نظریۂ زندگی کو قبول کر لیا ہو لیکن ہنوز اس کی روح ان کے دل کی گہرائیوں میں اتری ہو۔ انہیں حقوقِ شہریت تو تمام کے تمام حاصل ہوں گے۔ لیکن مملکت کے ایسے امور جن کا تعلق اس نظام کی اصل وبنیاد سے ہو وہ ان کے سپرد نہیں کئے جا سکیں گے۔ ان کی مناسب تعلیم وتربیت کا انتظام کیا جائے گا۔ اور

(۳) مومن۔ اسلامی نظریۂ زندگی کی صداقت جن کی روح میں حلول کر چکی ہو۔ یہ اس نظام کے قیام واستحکام کے حقیقی ضامن ہوں گے۔

واضح رہے کہ مسلم اور مومن الگ الگ گروہ نہیں ہوں گے۔ یہ ایک ہی امت کے افراد ہوں گے۔ ان میں ایسا ہی فرق سمجھئے جیسا (مثلاً) ایک تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ مسلمان میں فرق ہوتا ہے کہ آپ غیر تعلیم یافتہ

مسلمانوں کو امت کا الگ گروہ نہیں قرار دے سکتے، لیکن ان کے سپرد وہ کام بھی نہیں کئے جا سکتے جن کے لئے تعلیم کا ہونا ضروری ہے۔

ہم (موجودہ مسلمان) کس شق میں شامل ہیں اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہم اسلامی نظریۂ زندگی کا اقرار کرتے ہیں۔ اس لئے ہم مسلم ہیں، غیر مسلم نہیں ہیں۔ اس اعتبار سے ایک مسلمان اور دوسرے مسلمان میں (امت کا فرد ہونے کی حیثیت سے) کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ "پیدائشی مسلمانوں" کو مسلمان نہ سمجھنا اور اپنے آپ کو مسلمان قرار دینا، انانیت کی سرکشی اور تکبر نہیں تو جہالت کی خود فریبی ضرور ہے۔ یہ کہنا بھی زیادتی ہوگا کہ امت میں کوئی مومن نہیں۔ البتہ یہ واضح ہے کہ ایسی کوئی جماعت نظر نہیں آتی جو مومنین پر مشتمل ہو۔ اپنی دینداری کی ڈھونس جما کر اپنے آپ کو مومن تسلیم کرانے والوں کے متعلق ہم قرآن کا فیصلہ اوپر دیکھ چکے ہیں۔ اندریں حالات، اگر ہم کسی ملک میں اسلامی نظام قائم کرنا چاہیں تو اس کی یہی صورت ہو سکے گی کہ۔

(۱) موجودہ مسلمانوں کو قانون کے ذریعہ اس نظام کا پابند بنایا جائے۔ اور

(۲) آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کی جائے کہ اس نظام کی صداقت ان کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو جائے اور احکام خداوندی کی اطاعت ان کا اندرونی تقاضا ہو۔

اس طریق کار اور اُس طریق میں جسے نبی اکرمؐ نے اختیار فرمایا تھا، تقدم و تاخر کا فرق ہے۔ لیکن یہ فرق ناگزیر ہے۔ اس لئے کہ جب حضورؐ نے اپنی دعوت پیش کی ہے تو اس وقت مسلم کوئی نہیں تھا۔ سب غیر مسلم تھے۔ ان غیر مسلموں میں سے جو بھی اسلام قبول کرتا تھا مومن کی حیثیت سے قبول کرتا تھا۔ لہذا سابقون الاولون کی یہ جماعت مومنین کی جماعت تھی۔ یہی وہ "مہاجر و انصار" تھے۔ جنہیں قرآن نے "مومن حقا" کہہ کر پکارا ہے۔ اسلامی نظام کی بنیاد اسی جماعت کے ہاتھوں رکھی گئی تھی۔ اور یہی اس کی تشکیل و استحکام کے اولین ذمہ دار تھے۔ اس نظام میں "مسلم" بعد میں شامل ہوئے تھے۔ اس کے برعکس آج "مسلم" پہلے سے موجود ہیں۔ اور اس نظام کی تشکیل کا آغاز (اگر کرنا ہے تو) انہی سے کرنا ہے۔ ان "مسلموں" کو غیر مسلم قرار دے کر براہ راست مومن پیدا کرنے کی جو مہم ہمارے ہاں شروع ہوئی تھی (خواہ اسے مرزا غلام احمد صاحب نے شروع کیا ہو یا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے[1]) اس کا نتیجہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ ایک غیر مسلم، کسی کے ہاتھ پر "بیعت کرنے سے" مسلم تو ہو سکتا ہے لیکن ایک مسلم،

---

[1] جب مودودی صاحب نے اپنی جماعت کی تاسیس کی ہے تو اس میں داخل ہونے والوں کی تجدید ایمان اپنے ہاتھ پر کرائی تھی۔

محض کسی کے ہاتھ پر بیعت کر لینے سے مومن نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے تعلیم و تربیت کے مناسب پروگرام کی ضرورت ہوگی۔

طلوعِ اسلام کی دعوت یہی ہے کہ پاکستان میں قرآنی قوانین کے نفاذ سے موجودہ مسلمانوں کو ان کا پابند بنا دیا جائے۔ اور آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کی جائے کہ ایمان ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھرے۔

سلسبیل

چھپ کر تیار ہو گئی ہے۔ فرمائشوں کی تعمیل، اسی ترتیب کے مطابق ہو گی جس ترتیب سے فرمائشیں موصول ہوں گی۔ فہرست عنوانات ملاحظہ فرمائیے۔

عبادت
نظریۂ ارتقاء اور قرآن
نجات
ثواب
زکوٰۃ
میثاقِ خداوندی
مملکت کا قرآنی تصور
لاہور کا ایک علمی مذاکرہ
انسان اور خارجی کائنات
اردو زبان میں نماز

قرآن کے باطنی معانی
اسلام کیا ہے؟
اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟
دینِ خداوندی کے دشمن
انسان
شرک
ایک نورانی صبح
وہ مردِ درویش
لارڈ سر برٹرنڈرسل سے ایک ملاقات
پروفیسر ٹوئن بی سے چھ سوالات

کتاب سفید پرنٹنگ پیپر پر چھپی ہے۔ کتابت۔ طباعت دیدہ زیب۔ صفحات ۳۵۲

قیمت مجلد آٹھ روپے

ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ۔ لاہور

حقائق و عبر

۱- حرمِ کعبہ میں امن

قرآن کریم نے کعبہ کو اسلامی نظام کا مرکز محسوس قرار دیا ہے۔ اور چونکہ اسلامی نظام کی خصوصیت کبریٰ یہ ہے کہ وہ نوعِ انسان کے لئے پیامِ امن و سلامتی ہے۔ اس لئے اس نے کعبہ کے متعلق کہا ہے کہ وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا۔ جو اس میں داخل ہو گیا اسے امن نصیب ہو گیا۔ یعنی وہ انسان دنیا کی مستبد قوتوں کے مظالم سے محفوظ و مامون ہو گیا۔ لیکن آپ دیکھئے کہ ہمارے مذہب پرست طبقہ کے نزدیک اس امن کے کیا معنی ہیں۔ ۲۰ فروری سنہ ۱۹۶۲ء کے الاعتصام میں ایک صاحب (عبدالرحمٰن ناصر عسکری) کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے۔

"حرمین میں رمضان کی راتیں" اس میں وہ لکھتے ہیں۔

"یہاں ایک مشاہدہ کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ بلکہ اہلِ ایمان کی مسرتوں کا باعث ہوگا۔ یہ آیت زمانہ طفولیت سے لے کر آج تک ہزاروں مرتبہ نظر سے گزری کہ وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا جو حرم میں داخل ہو گیا وہ با امن ہو گیا۔ مگر اس کا مشاہدہ یہاں رہ کر ہوا۔ مکہ مکرمہ میں مچھر بہت زیادہ ہیں اور بالخصوص زمانہ حج میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔ شہر میں بلدیہ کی طرف سے دوائی چھڑکنے کا خاطر خواہ انتظام ہے۔ اور اس امر پہ کافی توجہ دی جاتی ہے مگر اس کے باوجود مچھروں میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوتی۔ آرام کی نیند سونا مشکل ہے۔ مگر حرم میں داخل ہوتے ہی اس موذی سے نجات مل جاتی ہے۔ یہاں کوئی دوائی نہیں چھڑکی جاتی۔ بلکہ حرم کے چاروں طرف دروازے ہیں۔ مچھر دروازوں تک رواج کرتے آتا ہے مگر اسے اندر کی اجازت نہیں ـــ وہ کون سی قوت ہے جو اسے اندر آنے سے روک دیتی ہے۔ کوئی غور تو کرے۔

ایک اور واقعہ میں نے خود دیکھا جس سے میرے آنسو نہ رک سکے۔ اور بے ساختہ زبان سے نکلا۔

صدق اللہ العظیم

" ومن دخلہ کان اٰمنا "

"واقعہ یہ تھا کہ میں ایک روز حرم میں بیٹھا ہوا تھا کہ میں نے چند چھڑوں کو یکجا تڑپتے دیکھا اور چند سیکنڈ میں بیجان ہو گئے۔ شاید یہ اکٹھے بالائی فضا سے اندر آ گئے تھے اور آتے ہی تڑپ کر مر گئے۔"

حرم کعبہ میں امن کے متعلق صاحب مضمون نے اپنے اس مشاہدہ کو قرآن کریم کے اس دعوے کی صداقت کے لئے بطور شہادت پیش فرمایا ہے کہ من دخلہ کان اٰمنا۔ لیکن اگر گستاخی معاف ہو تو ہم دریافت کر سکتے ہیں کہ اس واقعہ کے متعلق ان کا کیا ارشاد ہے جسے مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے اپنے مشاہدہ کے طور پر (میثاق بابت جنوری ۱۹۶۰ء میں) بیان فرمایا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا۔

اسی دوران میں ایک روز جلالتہ الملک اپنے وزراء اور احکام کے ساتھ طواف کے لئے تشریف لائے جو دن ان کے طواف کے لئے مقرر تھا۔ اس دن صبح ہی سے حرم اور اس کے قرب و جوار میں فوجی دستے نظر آنے لگے۔ عصر کے وقت میں نے دیکھا کہ حرم کی چھتوں۔ اس سے متصل سڑکوں اور حرم کے تمام گوشوں اور کونوں میں فوج کے آدمی کھڑے ہیں۔ عصر اور مغرب کی نمازوں کے درمیان میں نے اپنے ایک طواف کا وقت مقرر کر رکھا تھا۔ اس وقت جو پہنچا تو معلوم ہوا کہ آج اسی وقت جلالتہ الملک طواف کریں گے۔ اگلا زمانہ ہوتا تو ایک بادشاہ اور ایک گداگر دونوں بغیر کسی زحمت کے ایک ہی وقت میں طواف کر سکتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں تو اس چیز کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جب میں نے دیکھا کہ آج میرے طواف کا موقع نہیں ہے تو مطاف کے پلیٹ فارم پر بادشاہ کے طواف کی سیر کے لئے کھڑا ہو گیا۔ مطاف اور مطاف میں داخل ہونے کا ایک طرف کا راستہ عام آدمیوں سے بالکل خالی کرا لیا گیا تھا۔ راستہ اور مطاف کو ہر طرف سے نجدی فوج کے سپاہیوں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ پہلے جلالتہ الملک کے کچھ مقربین آئے اور کچھ دیر تک طواف کرتے رہے۔ اس کے بعد جلالتہ الملک ان کے وزراء۔ اور اعلیٰ حکام آئے اور انہوں نے طواف کیا۔ طواف کے بعد جلالتہ الملک اور ان کے ساتھیوں کے مغرب کی نماز حرم میں پڑھی۔ پہلی رکعت کے سجدے سے جب میں نے سر اٹھایا تو میں نے دیکھا کہ ہر طرف سے کچھ مسلح قدافی اٹھائے نماز میں بھی صفوں کے درمیان جلالتہ الملک کی نگرانی کر رہے ہیں۔

یعنی حریم کعبہ میں اگر مچھر انسانوں کو کاٹنے کے لئے آئیں تو وہ تڑپ تڑپ کر مر جاتے ہیں اور اس طرح خدا انہیں (انسانوں کو) ان کے شر سے محفوظ کر دیتا ہے۔ لیکن اسی کعبہ میں وہاں کے سب سے بڑے صاحب اقتدار

انسان کو اپنی حفاظت کے لئے فوجی دستوں کی ضرورت پڑتی ہے!

۲۔ علمائے ازہر

مصر کی جامعہ ازہر ہمارے مذہبی علوم کے لئے آخری سند کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن ذرا یہ دیکھئے کہ وہاں کے علماء کے متعلق ایک بہت بڑے عالم دین ــ ڈاکٹر مصطفیٰ احمد زرقا ــ کیا فرماتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

> جامع ازہر کے فضلاء نے ایسی کتابیں اور فتاویٰ شائع کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنا قلم دشمنانِ اسلام کے ہاتھ گروی رکھ دیا ہے۔ اور اسلام کی بنیادیں اس طرح ڈھا دینا چاہتے ہیں کہ جس طرح دشمن بھی نہیں ڈھا سکتے۔ اس قسم کے لوگوں کا دین سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ یہ تو منافق اور سازشی قسم کے لوگ ہیں جو اجتہاد اور آزادی رائے اور حریت فکر کے پردے میں دین کے ساتھ خیانت اور مذاق کرتے ہیں اور اس سازش اور خیانت کا ان کو بڑا معاوضہ مل رہا ہے اور خدا کی لعنت سے بے پرواہ ہو کر بڑے بڑے دنیوی منافع حاصل کر رہے ہیں۔
>
> (معارف دسمبر سنہ ۶۱ء بحوالہ "مدینہ۔ بجنور" مورخہ ۲۸ ۲/۶۲)

اور یہ چیز علمائے ازہر تک ہی محدود نہیں۔ ہمارے "علمائے کرام" میں سے ہر ایک دوسروں کے متعلق یہی کچھ کہتے رہتے ہیں اور پھر یہ علمائے کرام، کو "مسند رسول اللہ کا وارث"، "کانبیاء بنی اسرائیل" (انبیائے بنی اسرائیل کی مثل) اور دین میں سند و حجت بھی قرار دیتے ہیں۔

۳۔ نبوت کیسے ملتی ہے

دیوبند سے ایک ماہنامہ شائع ہوتا ہے ــ تذکرہ ــ اس کی (مارچ سنہ ۶۲ء کی اشاعت میں) علامہ ابو نصر محی الدین طبریؒ کی کتاب ــ مکارم الاخلاق ــ کے ایک باب کا ترجمہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ــ دعا۔ ترجمہ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کے قلم سے ہے۔ جو عثمانیہ یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر ہیں (یا شاید اب ریٹائر ہو چکے ہیں)۔ اس میں لکھا ہے۔

> ابو عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عادت تھی کہ جب وہ نماز (فرض) پڑھتے تھے تو اس کے بعد بہت دیر تک (عجز و انکسار کے ساتھ) اپنا بایاں گال پھر داہنا گال زمین سے

چپکائے رہتے اور پھر نفل پڑھتے۔

ابو جعفر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں "خدا تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی "کیا تو جانتا ہے کہ میں نے تجھے اپنی ہمکلامی کے لئے کیوں اختیار کیا۔ حالانکہ کسی اور مخلوق کو یہ شرف نہ مل سکا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ نہیں مجھے معلوم نہیں اے رب! خدا نے تعالیٰ نے کہا۔ اے موسیٰ میں نے اپنے بندوں کو خوب الٹ پلٹ کر دیکھا، مگر تجھ سے زیادہ منکسر کسی کو نہ پایا۔ تو نماز کے بعد میرے آگے زمین پر عاجزی سے گال لگائے رکھتا ہے۔"

۴۔ مرغ سے یہ کچھ سیکھو

اسی مضمون کے آخر میں یہ بھی درج ہے۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں کہ جب تم مرغ کی بانگ سنو تو کہو (سبوح قدوس ....) اور فرمایا مرغ سے پانچ خصلتیں سیکھو (۱) نماز کے وقت کی پابندی (۲) غیرت (۳) سخاوت (۴) شجاعت (۵) بہت سی بیویاں رکھنا۔

۵۔ تیری آواز مکے اور مدینے!

طلوع اسلام نے جب عرصہ ہوا یہ آواز بلند کی کہ حج مسلمانوں کی بین الملی کانفرنس ہے۔ جس میں وہ اپنے اور عالم انسانیت کے اجتماعی مسائل کا حل دریافت کرتے اور نوع انسان کی فلاح و بہبود کی تدابیر سوچتے ہیں تو مذہب پرست طبقہ کی طرف سے اس کی (حسب معمول) بڑی مخالفت ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ حج ایک خالص عبادت ہے اس میں سیاست کو گھسیٹ لانا اسے دینی فریضہ کے بجائے دنیاوی اجتماع بنا دینا ہے۔ لیکن للہ الحمد کہ اب آہستہ آہستہ یہ حضرات بھی اس طرف آ رہے ہیں اور قرآن کریم نے حج کا جو مقصد بیان کیا تھا اور جسے طلوع اسلام نے اتنا عرصہ پہلے پیش کیا تھا اس کی تائید کر رہے ہیں۔ چنانچہ جماعت اہل حدیث کے ترجمان الاعتصام نے اپنی ۱۲ / مارچ ۱۹۶۱ء کی اشاعت میں حج بیت اللہ کے عنوان سے جو مقالہ افتتاحیہ لکھا ہے اس میں کہا گیا ہے :-

"حج بیت اللہ جہاں اپنے دامن میں بے پناہ اجر و ثواب کی دولت سموئے ہوئے ہے وہاں اس کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ اسے مسلمانوں کے عالمگیر اجتماع کی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں ہر نسل، ہر ملک اور ہر علاقہ کے مسلمان جمع ہوتے اور باہم ملتے ہیں تاکہ وہ اپنی تکالیف اور ضروریات سے ایک دوسرے کو آگاہ کر سکیں۔ اور بتا سکیں کہ ان کے کیا ملکی مسائل ہیں۔ وہ کن قومی مشکلات میں محصور ہیں۔ اور کس طرف سے انہیں کن مصائب میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ پھر ان مشکلات کے رفع کرنے کی کوششیں

کی جائیں اور ان کے مسائل پر اجتماعی طور سے غور و فکر کیا جائے۔

خلفاء اسلام کے زمانہ میں یہ دستور تھا کہ خلفاء حج کو جاتے تو تمام صوبائی گورنروں، علاقائی رہنماؤں، اور ملک کے اونچے طبقہ سے بھی ملتے اور ان کے حالات دریافت فرماتے۔ علاوہ ازیں وہ عوام سے بھی رابطہ پیدا کرتے اور جس کے خلاف جو شکایت ہوتی وہ پوری توجہ سے سنتے اور رفع کرتے۔

اس وقت مسلمانوں کو بے شمار مسائل درپیش ہیں اور ہر ملک کسی نہ کسی مشکل میں گھرا ہوا ہے اور اس مشکل کا تعلق اگرچہ کسی ایک خاص ملک سے ہے لیکن اس کے اثرات ہمہ گیر ہیں اور اس پر غور و فکر کے لئے سب ملکوں کا اشتراک ضروری ہے۔ اگر تمام مسلمان ملکوں کے رہنما اس پر عمل شروع کر دیں اور حج کے موقع پر اپنا ایک اجتماع منعقد کریں تو یہ نہایت مفید رہے گا۔ اس سے ان کے آپس کے تعلقات بھی مستحکم ہوں گے، ان کے مسائل بھی جلد حل ہوں گے۔ دوسروں پر بھی اس کے بہترین اثرات مرتب ہوں گے۔ اور غیر مسلم ممالک بھی ان کے اس قسم کے اجتماع سے مرعوب ہوں گے۔ اور وہ سمجھیں گے کہ کوئی مسلمان ملک تنہا نہیں ہے بلکہ یہ متحد ہیں۔ اور اپنے مسائل اجتماعی رنگ میں غور و فکر کی میزان میں رکھتے ہیں۔ اس طریق غور و فکر کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ ان کے جو مسائل برسوں سے لاینحل پڑے ہیں ان کے بہت جلد حل ہونے کی صورتیں پیدا ہو جائیں گی۔

اس سلسلہ میں ہم اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس میں شبہ نہیں کہ آغاز کار کے طور پر اگر سردست اتنا ہی ہو جائے کہ حج کے موقع پر، مختلف ممالک کے نمائندگان ایک اجتماع منعقد کر کے امت کے الجھے ہوئے مسائل کا حل سوچیں تو غنیمت ہے۔ لیکن حج کے سلسلے میں اس حقیقت کو عام کرتے رہنا چاہیئے کہ حج کے اجتماع کا مقصد ہی یہ تھا اس لئے اس "تقریب" پر اس مقصد کے لئے ایک الگ اجتماع منعقد کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب اس اجتماع کی صحیح غرض و غایت سامنے آ جائے گی تو خود حج ہی اس مقصد کو پورا کر دیا کرے گا۔ اور یہی عبادت سے مقصود ہے۔ عالم انسانیت کے الجھے ہوئے معاملات کو وحی خداوندی کی روشنی میں سنوارنے سے بڑی عبادت اور کیا ہو سکتی ہے!

۶۔ جناب نیاز سے

نگار (پاکستان) بابت مارچ ۱۹۶۴ء میں "تاریخ اسلام میں کنیزوں کا اثر و اقتدار" کے عنوان سے جناب نیاز فتح پوری کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں۔

چنانچہ بردہ فروشی کے دائرے کو تنگ کرنے کے لئے اسلام نے صرف انہی لوگوں کو غلام بنانے کی اجازت دی جو اسیرانِ جنگ کی حیثیت سے ہاتھ آئیں اور جو نہ مسلمان ہوں نہ جزیہ ادا کریں۔

اسیرانِ جنگ کے متعلق قرآن کریم میں ایک ہی مقام پر حکم آیا ہے اور وہ یہ ہے۔

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً ---------- (۴۷/۴)۔

اور جب تم جنگ کے لئے کفار (مخالفین) کے مدمقابل آؤ تو ان کی گردنیں مارو۔ یہاں تک کہ تم ان پر غالب آ جاؤ تو ان کے قیدیوں کو مضبوطی سے باندھ لو پھر انہیں یا تو احسان رکھ کر (چھوڑ دو) یا معاوضہ لے کر۔

قرآن میں یہ کہیں بھی نہیں کہا گیا کہ جو لوگ اسیرانِ جنگ کی حیثیت سے ہاتھ آئیں اور وہ نہ مسلمان ہوں نہ جزیہ دیں تو انہیں غلام بنا لو۔ لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام نے دشمن کے قیدیوں کو غلام بنا لینے کی اجازت دی ہے اگر کہا جائے کہ احادیث سے اس کی اجازت ملتی ہے تو احادیث کے متعلق اسی نگار میں، خود جناب نیاز نے یہ لکھا ہے کہ

...... یہاں تک کہ مذہب اسلام نام ہو گیا حکومت اسلام کا۔ اور قرآن کی جگہ لے لی احادیث نے جو لاکھوں کی تعداد میں رسول اللہ کے نام سے گھڑی اور روایت کی جاتی تھیں۔ پھر ان احادیث میں سے ایک حصہ تو ایسا ہے جو صرف سیاسی مصالح کی بنا پر وضع کیا گیا اور ایک حصہ وہ ہے جس میں دل کھول کر دیگر مذاہب کی ان تمام روایتوں کو لے لیا جو عرب خاندانوں میں رائج تھیں اور تھوڑا سا تغیر کر کے ان کو "اسلامی چیز" کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ (ص۲۰)

بنابریں کسی بات کو "اسلامی" کہنے کے لئے سند صرف قرآن کریم کی پیش کرنی چاہیئے اور قرآن کریم میں اسیرانِ جنگ کے متعلق جو حکم ہے اسے ہم نے اوپر درج کر دیا ہے۔

طلوع اسلام
میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیجئے
آج ہی ایک کارڈ لکھ کر نرخ نامہ اشتہارات طلب فرمائیں۔

مجلسِ اقبال

مثنوی :۔ پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

باب ۔ دراسرارِ شریعت (مسلسل)

گزشتہ قسط میں حضرت علامہؒ نے اس حقیقت کی وضاحت کی تھی کہ انسانیت کی نجات کا راز اس نظام کے قیام میں پوشیدہ ہے جسے قرآن کریم نے تجویز کیا ہے اس سلسلہ میں انہوں نے بتایا تھا کہ یہ مسئلہ صرف قانون سازی (فقہ) کا نہیں۔

ویسے بھی قانون (فقہ) اپنے صحیح نتائج اسی صورت میں مرتب کر سکتا ہے جبکہ احترام اس قوم کے دل کی گہرائیوں سے اُبھرے۔ قانونِ خداوندی کی صداقت پہ ایمان ہی یہ نتائج پیدا کرتا ہے۔ قانون محض میکانکی طور پر عمل انسان میں داخلی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتا۔ نیست ایں کار فقیہاں سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے۔

حکمش از عدل است و تسلیم و رضاست ۔۔۔ بیخ او اندر ضمیر مصطفیٰؐ است

اس نظام (خداوندی) کا قانون "سرتاپا عدل پر مبنی ہے۔ باقی رہا اس پر عمل کرنا۔ تو صحیح عمل کے معنی یہ ہوں گے کہ اس شخص کے دل کی گہرائیوں میں بھی اس کے خلاف کوئی گرانی محسوس نہ ہو ۔۔۔ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۔۔۔ (۴/۶۵)۔ کامل تسلیم و رضا کا یہ وہ شجرِ طیب ہے جس کی جڑ قلبِ مصطفوی میں پیوست ہے۔

اس کے بعد دو اشعار مضمون کے تسلسل سے ہٹ کر آئے ہیں۔ اس میں حضرت علامہ نے اہل تصوف سے کہا ہے کہ تم خدا کے وصال کے طالب رہتے ہو۔ انسان کا خدا سے وصال ناممکن ہے۔ اگر خدا کسی کے سامنے بے حجاب آجائے تو وہ (جس کے سامنے اس طرح خدا آجائے) خود باقی ہی نہ رہے۔ لہٰذا یہ مسلک صحیح نہیں۔ ہمیں وصالِ خداوندی کا نہیں بلکہ رضائے خداوندی کا طالب رہنا چاہیئے۔ اشعار یہ ہیں۔

از فراق است آرزوہا سینہ تاب تو نمانی چوں شود او بے حجاب

از جدائی گرچہ جاں آید بلب وصلِ او کم جو، رضائے او طلب

اس کے بعد مضمون کے تسلسل میں ہے۔

مصطفیٰؐ داد از رضائے او خبر نیست در احکامِ دیں چیزے دگر

خدا نے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جونسا راستہ بھی چاہے اپنے لئے اختیار کرسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی خدا نے، بوساطت رسالتِ محمدیہ یہ بھی بتا دیا کہ سچا راستہ کون سا ہے۔ اور یہ کہ خدا چاہتا یہ ہے کہ انسان اپنی مرضی سے، اس راستے کو اختیار کرے۔ اسی کا نام خدا کی رضا طلبی ہے۔ کائنات میں ہر شئے وہ کچھ کرتی ہے جو خدا چاہتا ہے لیکن وہ ایسا اپنی مرضی سے نہیں بلکہ مجبوراً کرتی ہے۔ اسلئے کائنات کو اختیار و ارادہ دیا ہی نہیں گیا۔ انسان سے کہا گیا کہ وہ اپنی مرضی سے وہ کچھ کرے جو خدا چاہتا ہے۔ وحی کی رو سے مے گئے قوانینِ خداوندی یہ بتاتے ہیں کہ خدا انسان سے کیا چاہتا ہے۔ دین کے احکام کی یہی غایت ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ کون سا راستہ منشائے خداوندی کے مطابق ہے۔

تختِ جم پوشیدہ زیرِ بوریاست فقر و شاہی از مقاماتِ رضاست

اسلام خانقاہیت نہیں سکھاتا۔ وہ حکمرانی سکھاتا ہے۔ لیکن اس کی حکمرانی اس لئے نہیں کہ صاحبِ حکومت فرد یا طبقہ غریبوں کی کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرے۔ وہ حکمرانی اس لئے ہے کہ کوئی فرد، اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہنے پائے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام قائم کرنے کے لئے بڑے ایثار کی ضرورت ہوگی۔ اس نظام کا سربراہ، اس ایثار کی مثال پہلے خود قائم کرے گا۔ یوں حکمرانی بھی منشائے خداوندی کے مطابق ہوگی۔ اگر شاہی اور فقیری میں اس قسم کا امتزاج نہ ہو تو نہ شاہی منشائے خداوندی کے مطابق ہوتی ہے نہ فقیری۔ وہ شاہی چنگیزیت بن جاتی ہے اور فقیری مسلک خانقاہیت کی مظہر۔ جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔

حکمِ سلطاں گیرد از حکمش مثال روز میداں بیعت، روز قیل و قال

جب اس قسم کا نظام قائم ہو جائے (جسے خلافت علیٰ منہاج نبوت کہا جاتا ہے) تو افرادِ معاشرہ کا فریضہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ امیر کی اطاعت بلا چون و چرا کریں۔ اس نظام میں زندگی ایک مسلسل جہاد بن جاتی ہے جس میں ہر آن مخالف قوتوں سے ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر فوج کے سپاہی میدانِ جنگ میں اپنے کمانڈر کے حکم کے خلاف بحث و تمحیص شروع کردیں تو اس فوج کو ہر میدان میں شکست ہوگی۔ اسلامی نظام کا امیر احکامِ خداوندی ہی کی اطاعت کرتا ہے۔ اس لئے۔

تا توانی گردن از حکمش مپیچ تا نہ پیچد گردن از حکمِ تو ہیچ

تم اس کے حکم سے سرکشی نہ برتو۔ تمہاری اس اطاعت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ باطل کی ہر قوت تمہارے سامنے جھک جائے گی۔

از شریعت احسن التقویم شو
وارث ایمانِ ابراہیم شو

اس طرح احکام شریعت کی پابندی سے اپنی ذات کی نشو ونما کا سامان پیدا کئے جاؤ۔ تم جس قدر زیادہ اطاعت گزار ہو گے اسی قدر تمہاری ذات کی وسعتیں بڑھ جائیں گی۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا ـــ کے یہی معنی ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں پابندیٔ حدود کی تاکید اس لئے کرتا ہے کہ اس پابندی سے تمہاری ذات میں وسعت پیدا ہو جائے گی۔

می شود از جبر پیدا اختیار
یہی وہ مقامِ ابراہیمؑ ہے جسے حاصل کرنے کی تلقین ہر مومن کو کی گئی ہے۔

علامہ اقبالؒ نے تصوف کو اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودے سے تعبیر کیا تھا۔ یہ بہت بڑی حقیقت تھی جسے انہوں نے اس طرح واشگاف کیا۔ آئندہ بند میں وہ اربابِ تصوف سے کہتے ہیں کہ جس چیز کو تم طریقت کہتے ہو، وہ طریقت نہیں۔ طریقتؒ[1] سے مراد صرف یہ ہے کہ انسان احکام شریعت کی غرض وغایت اور منتہیٰ ومقصود کو اس طرح اپنائے کہ وہ اس کے لئے جزوِ حیات بن جائے۔ جب یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی تو انسان ان احکام کو کہیں خارج سے عائد شدہ خیال نہیں کرے گا بلکہ وہ محسوس کرے گا کہ وہ اس کے دل کی آواز اور تقاضائے حیات ہیں۔ جس طرح (مثلاً) جب انسان کو پیاس لگتی ہے اور وہ پانی پیتا ہے تو وہ کسی خارج سے عائد شدہ حکم کی تعمیل نہیں کرتا بلکہ اپنے اندرونی تقاضے کی تشکیل کا سامان فراہم کرتا ہے۔ خارج سے عائد شدہ احکام کی پابندی مجبوری کہلاتی ہے۔ لیکن خود اپنے اندرونی تقاضے کی تعمیل مجبوری نہیں ہوتی۔ اس حقیقت کو علامہ اقبالؒ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں کہ

پس طریقت چیست اے والا منشؒ		شرح رازش بہ اعماقِ حیات
فاش می خواہی اگر اسرارِ دیں		جز بہ اعماقِ ضمیرِ خود مبیں
گر نہ بینی۔ دینِ تو مجبوری است		ایں چنیں ایں از خدا مہجوری است

---

[1] طریقت کا لفظ قرآن میں نہیں آیا۔ اسلام میں اس قسم کی اصطلاحات دوسروں سے مستعار لی گئی ہیں۔

آخری شعر میں کتنی عظیم حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ اگر دین کے احکام کی تعمیل محض رسمی طور پر کی جائے تو اس سے "قربِ خداوندی" حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس سے انسان، خدا سے بہت دور رہتا ہے۔ مسلمان صدیوں سے یہی کچھ کر رہا ہے۔ اور دن بدن خدا سے دور ہوتا چلا جا رہا ہے۔

- انسان صاحبِ اختیار ہے یا مجبور۔ یہ سوال فلسفہ کی دنیا میں شروع سے مابہ النزاع چلا آ رہا ہے اور متکلمین کے ہاں سے اس کا آج تک کوئی اطمینان بخش جواب نہیں مل سکا۔ حضرت علامہ کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ

بندہ تا حق را نہ بیند آشکار برنمی آید ز جبر و اختیار

انسان جب تک حق و صداقت کو یوں بے پردہ نہ دیکھ لے، جس طرح اوپر کہا گیا ہے۔ یعنی وہ وحی کے احکام کو اپنی زندگی کا تقاضا نہ محسوس کرے ــــ تو وہ "جبر و اختیار" کی الجھن سے کبھی نہیں نکل سکتا۔ جب ان احکام کی پابندی اس کے دل کی آواز بن جائے گی تو وہ دیکھ لے گا کہ جبر و اختیار کی حدود کیا ہیں۔ اور کس طرح جبر سے اختیار پیدا ہو جاتا ہے۔

تو یکے در فطرتِ خود غوطہ زن مردِ حق شو، بر ظن و تخمیں متن

تا بہ بینی زشت و خوب کار چیست اندریں نہ پردہ اسرار چیست

علامہ نے یہاں "فطرت" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ہمارے نزدیک انسان کی فطرت کچھ نہیں۔ "فطرت" مجبور چیزوں کی ہوتی ہے۔ صاحبِ اختیار کی فطرت نہیں ہوتی۔ اس میں کچھ صلاحیتیں ہوتی ہیں جن کے متعلق اسے اختیار دیا جاتا ہے۔ وہ انہیں جس طرح چاہے اختیار کرے۔ لہٰذا یہاں فطرت سے مراد دل کی گہرائی ہی ہو سکتی ہے۔ جب انسان، وحی کے احکام کی علم اور غایت کو اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کرے گا تو اس پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ خیر کیا ہے اور شر کیا۔ اور یوں کائنات کے مستور راز اس پر بے نقاب ہو جائیں گے۔

ہر کہ از سرّ نبی گیرد نصیب ہم بہ جبریل امیں گردد قریب

جو شخص اس طرح قرآنی بصیرت سے بہرہ یاب ہو جاتا ہے وہ "ہمپایۂ جبریل امین" بن جاتا ہے۔ یعنی وحی کے اسرار و رموز سے آگاہ۔

اس کے بعد حضرت علامہ پھر اربابِ تصوف کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ

اے کہ می نازی بہ قرآنِ عظیم تا کجا در حجرہ می باشی مقیم

در جہاں اسرارِ دیں را فاش کن نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کن

تم لوگ قرآن پر بڑا ناز کرتے ہو ــ بلکہ کہتے یہ ہو کہ ـــ من ز قرآں مغز را برداشتیم۔ قرآن کی اصل غرض و غایت تمہاری ہی سمجھ میں آئی ہے۔ لیکن تمہاری بدبختی زندگی یہ ہے کہ تم حجروں میں بیٹھے "سلوک کی منزلیں" طے

کرتے ہو؟ ——— کیا قرآن کی رُو سے زندگی کا مقصد یہی ہے۔ تم ان حجروں سے باہر نکلو۔ اور دنیا میں دین کا نقطۂ ماسکہ اور شریعت کا منتہیٰ و مقصود واشگاف کرو۔

دین کا نقطۂ ماسکہ اور شریعت کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے؟ اسے حضرت علامہؒ نے ایک مصرع میں بیان کر دیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اس قدر جامع و مانع ہے کہ اس پر کچھ اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ نقطہ یہ ہے کہ

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس　　نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

"دنیا میں کوئی شخص کسی دوسرے کا محتاج نہ رہے"۔ بس یہ ہے شریعت کا منتہیٰ۔ اور یہ چیز اسی صورت میں ممکن ہے کہ دنیا میں اسلامی نظام متشکل ہو جائے۔ دین کی ساری غائت یہ تھی۔ لیکن

مکتب و ملا سخن ہا ساختند　　مومناں این نکتہ را نشناختند

دین کی علم تو یہ تھی۔ لیکن مُلّا نے مسلمان کو عجیب عجیب باتوں میں الجھا دیا۔ نتیجہ یہ کہ مسلمان کی نگاہ سے دین کی یہ اصل و غائت ہی اوجھل ہو گئی۔ اور وہ بھی حقیقت کو چھوڑ کر افسانوں کے پیچھے لگ گیا۔ یوں ہوا یہ کہ

زندہ قومے بود از تاویل مُرد　　آتش او در ضمیرِ او فسرد

جب قرآن کی حقیقی تعلیم اس کے سامنے تھی تو یہ ایک زندہ قوم تھی۔ لیکن جب مُلّا نے قرآن کی اس تعلیم کو "تاویلات" کے پردوں میں چھپا دیا تو وہی قوم راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔

صوفیانِ باصفا را دیدہ ام　　شیخِ مکتب را نکو سنجیدہ ام

میں نے صوفیائے کرام کو بھی دیکھا ہے اور علمائے عظام کو بھی۔

عصرِ من پیغمبرے ہم آفرید　　آں کہ در قرآں بغیر از خود ندید

حتیٰ کہ ہمارے زمانے میں ایک "پیغمبر" (میرزا صاحب) بھی پیدا ہو گئے ——— ان کی کیفیت یہ تھی کہ انہیں قرآن میں اپنے تذکرہ کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔

ہر یکے دانائے قرآن و خبر　　در شریعت کم سواد و کم نظر

ان میں سے ہر ایک کی کیفیت یہ ہے کہ قرآن اور حدیث کے عالم ہونے کے مدعی ہیں۔ لیکن حرام جو ان میں سے کسی کو معلوم ہو کہ شریعت کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے۔ بڑے کوتاہ نگاہ بڑے کور ذوق!

عقل و نقل افتادہ در بندِ ہوس　　منبرِ شاں، منبرِ کاک است و بس

ان کے ہاں روایت ہو یا درایت، سب سے مقصد اپنے مفاد کا حصول اور ہوس پرستی ہے۔ دین ان کے نزدیک معاش کا ذریعہ ہے۔ ان کا منبر روٹی بیچنے والے (نانبائی) کی میز ہے۔ اور بس۔

زیں عجماں نیست امید کشود　　آستیں با سبے ید بیضا چہ سود؟

ان کے ہاتھوں، کامیابی کی کوئی امید نہیں ہوسکتی۔ جن آستینوں میں نور حق موجود نہ ہو، ان سے کس فائدے کی توقع کی جاسکتی ہے؟

کار اقوام دملل ناید درست تا
از عمل بنما کہ حق در دست تست

قوموں کی اصلاح، ان مدعیان دین سے کبھی نہیں ہوسکتی۔ تم باتیں کرنا چھوڑو اور قرآن کا معاشی نظام قائم کرکے اس کے درخشندہ اور زندگی بخش نتائج سے دنیا کو دکھا دو کہ حق و صداقت تمہارے پاس ہے۔

اشکے چند برافتراق ہندیاں

علامہ اقبال نے یہ مثنوی اس زمانہ (سنہ ۱۹۳۶ء) میں لکھی تھی۔ جب ہندوستان پر انگریزی استعماریت کا غلبہ تھا اور اگرچہ ہندوستان کے باشندے انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کے باہمی اختلافات ان کی اجتماعی قوت کو بڑا نقصان پہنچا رہے تھے۔ آزادی کے ایک سچے علمبردار کی حیثیت سے علامہ کا دل، اپنے ملک کے باشندوں کے اس افتراق و انتشار پر خون کے آنسو روتا تھا۔ وہ سنہ ۱۹۳۰ء میں اس مسئلہ کا حل، ہندوؤں اور مسلمانوں کی جداگانہ مملکتوں کی شکل میں پیش کر چکے تھے۔ لیکن ایک طرف ہندوؤں کی تنگ نظری اسے قبول کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ دوسری طرف خود مسلمانوں میں سے ایک عنصر (نیشنلسٹ مسلمان۔ بالخصوص طبقہ علماء) اس اسکیم کی شدت سے مخالفت کر رہا تھا۔ ان کی ان باہمی آویزشوں کا نتیجہ تھا کہ انگریز کی غلامی کے جال کی گرہیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جارہی تھیں۔ یہ تھی وہ صورت حالات جس کے پیش نظر انہوں نے بصد تاسف کہا کہ

اے ہمالہ، اے اٹک، اے رود گنگ
زیستن تا کے چناں بے آب و رنگ

اے ہندوستان کے رہنے والو! تم اس قسم کی زندگی پر ــــ جو حقیقی زندگی کے آب و رنگ سے یکسر محروم ہے کب تک قانع رہو گے؟

پیر مرداں از فراست بے نصیب
نوجواناں از محبت بے نصیب

یہاں حالت یہ ہوچکی ہے کہ قوم کے بڑے بوڑھوں میں وہ فراست و بصیرت نہیں رہی جن سے قوموں کے مسائل حل ہوا کرتے ہیں۔ اور اس کے نوجوان طبقہ کے دل آزادی کی محبت کے جذبات سے خالی ہیں ورنہ ان کے جوشش کردار سے توقع کی جاسکتی تھی کہ غلامی کے ان بندھنوں کو توڑ ڈالیں گے۔ کس قدر تاسف انگیز ہے یہ حقیقت کہ

شرق و غرب آزاد و ما نخچیر غیر
خشت ما سرمایۂ تعمیر غیر

مشرق و مغرب کے ممالک آزاد ہونے چلے جا رہے ہیں۔ اور ہم غیروں کی غلامی میں زندگی کے دن بسر کرتے ہیں ہمارا ملی سرمایہ، سب دوسروں کی عمارات کی تعمیر میں صرف ہو رہا ہے۔ اپنا کچھ نہیں بنتا۔

زندگانی بر مرادِ دیگراں | جاوداں مرگ است نے خواب گراں

دوسروں کی منشا کے مطابق زندگی بسر کرنا، زندگی نہیں موت ہے۔ اگر یہ موت نہ ہوتی، صرف نیند ہوتی تو بھی توقع کی جا سکتی تھی کہ تم کسی دن جاگ اٹھو گے۔ لیکن موت ــــ اور وہ بھی مرگِ جاوداں کے بعد، حیاتِ نو حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔

نیست ایں مرگے کہ آید ز آسماں | تخم او می بالد اندر عماقِ جاں

یہ موت ایسی نہیں جو تم پر کہیں باہر سے وارد ہوئی ہو۔ اس کا بیج خود تمہارے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہے۔ اگر یہ مصیبت خارج سے وارد شدہ ہوتی تو اس کا علاج بھی خارج سے ہو سکتا۔ لیکن یہ تو تمہارے اندر ایک نفسیاتی تبدیلی سے وارد ہوئی ہے۔ لہٰذا جب تک تم اپنے اندر تبدیلی پیدا نہیں کرو گے اس سے نجات حاصل نہیں ہو سکے گی۔ قوموں کی موت و حیات کا یہی وہ اصولِ محکم ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ــــــــ (۱۳/۱۱)

خدا کسی قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں کرتا۔ جب تک وہ قوم خود اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا کر لے۔

غلامی سے قوموں پر طبعی موت نہیں آتی۔ غلام قوم کے افراد، حاکم قوم کے افراد کی طرح جیتے جاگتے۔ چلتے پھرتے۔ کھاتے پیتے۔ سانس لیتے نظر آتے ہیں۔ لہٰذا طبعی طور پر وہ زندہ ہوتے ہیں لیکن موت ان کے احساسات اور نظریات پر طاری ہوتی ہے۔ ان کے قلب و دماغ مردہ ہوتے ہیں۔ اس لئے

صیدِ او نے مردہ شو خواہد نہ گور | نے ہجومِ دوستاں از نزد و دور

جائے کس در غمِ او چاک نیست | دوزخِ او آں سوئے افلاک نیست

جو اس موت کے ہاتھوں مرتا ہے، اسے نہ غسل دینے والے کی ضرورت ہوتی ہے نہ گورکن کی حاجت۔ نہ اس کے جنازہ پر اس کے دوستوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ نہ کوئی اس کے غم میں ماتم گسار اور سینہ چاک۔ یہ قوم مردہ ہوتی ہے اور جہنم کے عذاب میں گرفتار۔ لیکن اس کا جہنم وہ نہیں ہوتا جس میں لوگ مرنے کے بعد حیاتِ اُخروی میں ڈالے جائیں گے۔ وہ جہنم اس دنیا میں ہوتا ہے۔

در ہجومِ روزِ حشر او را مجو | ہست در امروزِ او۔ فردائے او

اس قوم کو "حساب کتاب" کے لئے میدانِ حشر میں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ کسی پر "کل" کو بیتنی ہے وہ اس پر "آج" ہی بیت رہی ہوتی ہے۔ اس کے اعمال کا نتیجہ ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتا چلا جاتا ہے اور اپنی

نتائج کا نام غلامی اور محکومی کا وہ درد انگیز عذاب ہے جس میں یہ قوم مبتلا ہوتی ہے۔

ہر کہ ایں جا دانہ کشت ایں جا درود　　　پیش حق آں بندہ را محشر چہ سود

جس قوم کے اعمال کے نتائج اس دنیا میں سامنے آچکے ہوں اسے قیامت کے دن کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی قیامت تو ہر وقت اس کے سامنے موجود ہوتی ہے۔

اے کہ از آرزو بیگانۂ نہ خود　　　نقش او را فطرت از گیتی سترد

جس قوم کے دل میں زندگی کی آرزو اور آزادی کی حرارت باقی نہیں رہتی، فطرت کا اٹل قانون اس قوم کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا ہے۔ قومیں تخلیق مقاصد سے زندہ اور حصولِ آرزو سے پائندہ ہوتی ہیں۔ جو قوم کسی کی غلام ہو جائے اور پھر اس غلامی کی زندگی پر رضامند، وہ زندگی کی مستحق ہی نہیں رہتی۔ حکمران قوم محکوم قوم کے دل و دماغ پر ایسا جادو کر دیتی ہے کہ اسے کوئی شے اس کے اصلی رنگ میں نظر ہی نہیں آتی۔

اعتبار تخت و تاج از ساحری است　　　تخت چوں سنگ ایں زجاج از ساحری است

ملوکیت اور استعماریت کی حقیقت، تارِ عنکبوت سے زیادہ کچھ نہیں۔ لیکن حکمران قوم کی جادوگری کا اثر ہے کہ محکوم قوم، اس سے ڈرتی اور کانپتی رہتی ہے۔ اس کی قوت، مکڑی سے زیادہ نہیں ہوتی۔ لیکن محکوم قوم کی نگاہوں میں وہ سخت پتھر بن کر دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ انگریز قوم کی اس نگاہ بندی کا نتیجہ ہے کہ

درگذشت، از حکم ایں سحر مبیں　　　کافری از کفر و دینداری ز دیں

نہ ہندو اپنے مسلک پر قائم رہا ہے نہ مسلمان۔ دونوں نے حاکم قوم کے تصورات و نظریات اختیار کر لئے ہیں اور اب انہیں ہر شے انہی کی عینک سے دکھائی دیتی ہے

ہندیاں با یک دگر آویختند　　　فتنہ ہائے کہنہ باز انگیختند

اس سحر سامری کا اثر ہے کہ ہندو اور مسلمان بجائے اس کے کہ دونوں متحد ہو کر انگریز کے خلاف کھڑے ہوں، ایک دوسرے کی سر پھٹول میں مصروف ہیں اور اس کے لئے تاریخی افسانوں کو اچھال اچھال کر سامنے لا رہے ہیں تاکہ ان کے اختلاف کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی جائے۔

تا فرنگی قومے از مغرب زمیں　　　ثالث آمد در نزاع کفر و دیں

یہ دونوں آپس میں جھگڑتے ہیں۔ اور سرزمینِ مغرب کا فرنگی ان کے کفر اور دین کی نزاع کا فیصلہ کرنے کے لئے "حکایت کے بندر" کی طرح ثالث بن کر آ کھڑا ہوتا ہے۔

کس نداند جلوۂ آب از سراب

انقلاب اے انقلاب! اے انقلاب!!!

اس ساحری کا اثر ہے کہ اہلِ ہند غلامی اور آزادی میں فرق کرنے کے قابل نہیں رہے۔ یہ غلامی کی چند مراعات کو آزادی سمجھ رہے ہیں ـــ وائے نادانی قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو ـــ اس فریب سے نکلنے کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہاں انقلاب برپا کیا جائے۔

لیکن اس انقلاب کے لئے ضروری ہے کہ پہلے قوم کے قلب و نگاہ میں انقلاب پیدا کیا جائے۔ ان کی نگاہوں کے زاویے بدلے جائیں۔ ان کی اقدار بدل جائیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اسے بتایا جائے کہ حیوان اور انسان کی زندگی میں فرق کیا ہے۔ اس سلسلہ میں علامہ فرماتے ہیں۔

اے ترا ہر لحظہ فکرِ آب و گِل　　　از حضورِ حق طلب یک زندہ دل

حیوان کی زندگی صرف طبعی زندگی ہے۔ اس کے تقاضے صرف جسم کی پرورش کے تقاضے ہیں لیکن انسان کو جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی عطا ہوئی ہے اور وہ ہے اس کی ذات یا نفس۔ اسے "دلِ زندہ" سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا قلب و نظر میں انقلاب کے لئے ضروری ہے کہ انسان کی نگاہ جسمانی تقاضوں پر ہی نہ رہے۔ انسانی ذات کی نشوونما بھی اس کے سامنے ہو۔

آشیانش گرچہ در آب و گِل است　　　از فلک برگشتہ این یک دل است

یہ جسمِ خاکی تو اس طائرِ نہالِ سدرہ (انسانی ذات) کا محض آشیانہ ہے۔ اس کی پرواز کی اقطار السمٰوات والارض سے بھی آگے ہے۔ یہ تمام سلسلۂ کائنات اس کی آماجگاہ اور اس کے عشق میں سرگرداں ہے۔

تا نہ پنداری کہ از خاک است او　　　از بلندی ہائے افلاک است او

یہ خیال نہ کر لینا کہ انسانی ذات بھی مادہ ہی کی پیداوار ہے۔ نہیں! یہ روحِ خداوندی ہے۔ اس کا سرچشمہ مادی کائنات سے ماورا ہے۔

این جہان او را حریمِ کوئے دوست　　　از قبائے لالہ گیرد بوئے دوست

یہ مادی کائنات اس کے لئے محبوب کی گلیاں ہیں۔ اس کی تسخیر سے یہ اپنے اندر صفاتِ خداوندی منعکس کرتا ہے۔ یہ دنیاوی زیب و زینت میں بھی اپنے محبوب کے پیرہن کی خوشبو پاتا ہے۔

ہر نفس با روزگار اندر ستیز　　　سنگِ راہ از ضربتِ او ریز ریز

مادی کائنات کے ساتھ اس کی ہر وقت کشمکش جاری رہتی ہے کیونکہ یہ اپنی پختگی اس کی تسخیر سے کرتی ہے۔ اس کے راستے میں جو مادی موانعات آتے ہیں، یہ انہیں اپنی ضربِ کاری سے ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔ "ہنر کی ٹھوکر" اس کے رستے میں سنگِ راہ نہیں ہوتی۔ اس کی روانی میں تیزی پیدا کرنے کا موجب ہوتی ہے۔

آشنائے منزلِ دارا است او　　　آتشِ خود را نگہدار است او

یہ علم و عشق دونوں کے مقامات سے واقف ہے۔ یہ اپنی خودی کی حفاظت خود کرتی ہے۔

آبجے رہ بحرہا دارد ہبر — می دہد موجش ز طوفانے خبر

یہ یوں تو ایک چھوٹی سی ندی ہے۔ لیکن اس کی وسعتیں اس قدر بے پایاں ہیں کہ اس کی آغوش میں بڑے بڑے سمندر چھپے ہوتے ہیں۔ اس کی ایک ہلکی سی موج، طوفانِ عظیم کی خبر دیتی ہے۔

زندہ و پائندہ بے تاب تپور — میرد آں ساعت کہ گردد بے حضور

اس کی زندگی کا دار و مدار کھانے پینے پر نہیں۔ یہ تو اپنے اندر صفاتِ خداوندی بیدار کرنے سے زندہ رہتی ہے۔ اگر اس میں ان کا انعکاس نہ ہو تو سمجھ لیجئے کہ یہ زندہ نہیں مُردہ ہے۔

چوں چراغ اندر شبستانِ بدن — روشن از وے خلوت و ہم انجمن

مادی کائنات کی تاریکیوں میں روشنی اسی کے دم سے ہے۔ انسانی زندگی کا ظاہر ہو یا باطن، اس کی تابناکی اسی کی رہینِ منت ہے۔

ایں چنیں دل خود نگر۔ اللہ مست — جز بہ درویشی نمی آید بدست

اس قسم کی زندہ و پائندہ۔ روشن و تابناک متاعِ گراں بہا، جو اپنی حفاظت آپ کرتی ہے اور جو صفاتِ خداوندی کی کیف باریوں سے سرمست ہوتی ہے۔ اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ انسان جسم کے مادی تقاضوں کا غلام بن کر نہ رہ جائے۔ بلکہ ان تقاضوں کو اپنی ذات کے تقاضوں کے تابع رکھے۔ اسی کا نام "درویشی" ہے

اے جواں دامانِ او محکم بگیر

در غلامی زادۂ آزاد میر

اے قوم کے نوجوانو۔ تم اپنی ذات کا دامن مضبوطی سے تھامو۔ اس کی نشوونما کی فکر کرو۔ جب تمہاری نگاہوں میں اس کی قدر و قیمت واضح ہو جائے گی تو پھر تم غلامی کی زندگی پر قانع رہ نہیں سکو گے۔ تمہارے قلب و نگاہ میں وہ انقلاب پیدا ہوگا جس سے تمہاری غلامی کی زنجیریں کٹ جائیں گی اور تم محکومی کے چنگل سے نکل کر آزادی کی فضائے بسیط میں بال کشا ہو جاؤ گے۔

محکومی سے نجات حاصل کرنے کی یہ صحیح تدبیر ہے۔

مفت

مجرب دوا۔ برائے دمہ۔ درد گردہ و پتھری

حاجی محمد دین۔ شیخ آرٹس فیکٹری۔ متصل گنیش کمپاؤنڈ۔ لارنس روڈ۔ کراچی۔

نوٹ:۔ جوابی لفافہ ضرور آنا چاہیئے۔

بزم طلوع اسلام کراچی نے گزشتہ اگست میں بڑے تزک احتشام سے میلاد النبیؐ کی جو تقریب منائی تھی اس سے متعلق تین تقاریر پچھلے شماروں میں آچکی ہیں۔ اب یہ آخری تقریر شائع کی جا رہی ہے۔ ادارہ۔

انقلابِ عظیم

(محترم محمد اسلم صاحب)

قومی زندگی میں تیوہاروں کی تقریبات خاص اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ تیوہار درحقیقت کسی قوم کے اجتماعی جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہوتے ہیں اور اظہارِ جذبات بشرطیکہ وہ آئین و ضوابط اور سنجیدگی و شرافت کی حدود سے تجاوز نہ کریں انسانی ذات کی بالیدگی اور نشوونما کا سبب بنتے ہیں یہ تیوہار عموماً کسی اہم واقعہ کی یاد میں منائے جاتے ہیں۔ جس واقعہ کی یاد میں کوئی قوم اپنا تیوہار مناتی ہے اس سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس قوم کے نزدیک زندگی کے مختلف عناصر کی اہمیت کا معیار کیا ہے۔
اسلامی زندگی میں درحقیقت مسلمانوں کے لئے دو ہی تقریبات ہیں۔ ایک نزولِ قرآن کی عید اور دوسری عید میلاد النبیؐ اور یہ دونوں تقریبات بھی اصل میں ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں اس لئے کہ نہ رسول اللہؐ کو قرآن سے الگ کیا جا سکتا ہے اور نہ قرآن کو رسول اللہؐ سے۔ قرآن، قلبِ محمدیؐ پر نازل شدہ وحیٔ خداوندی کا نام ہے اور رسول اللہؐ قرآنی سیرت کے درخشندہ پیکر۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے صرف احکام و قوانین ہی عطا نہیں کئے بلکہ سیرتِ محمدیہؐ کے اصولی گوشوں کو بھی اپنے دامن میں محفوظ کر لیا ہے۔ قرآن کے بسیط حقائق اور فطری قوانین کو ایک جیتے جاگتے عملی نظام کی شکل میں سب سے پہلے حضور نبی اکرمؐ نے پیش کیا۔ ہمارے ہاں اس حقیقت کبریٰ کی یاد تازہ کرنے کے لئے حضورؐ کی یوم پیدائش کو بطور جشنِ مسرت منایا جاتا ہے، جسے عام طور پر عید میلاد النبیؐ کہا جاتا ہے۔ آج ہم سب بھی اسی جشنِ مسرت میں شریک ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس تقریب سعید کے موقع پر حضورؐ کی سیرت طیبہ کو قرآنی حقائق کی روشنی میں پیش کیا جائے۔

رسالت محمدیہؐ کا مقصود کیا ہے؟ حضورؐ نے نوعِ انسانی کو کیا دیا ہے؟ آپؐ کا وہ کون سا کارنامہ ہے جس کی وجہ سے حضورؐ کا نام گرامی محسنینِ عالم انسانیت کی فہرست میں سرِعنوان چمکتا دکھائی دیتا ہے۔ قرآن کریم نے ان تفاصیل کو بڑی حسن و خوبی سے ایک فقرہ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ سورۂ اعراف میں بعثتِ محمدیؐ کی غرض و غایت کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۝ (۷/۱۵۷) (وہ نوعِ انسانی کے سر سے ان تمام بوجھوں کو اتار کر رکھ

دے گا جن کے نیچے وہ دبی ہوئی ہے اور ان تمام زنجیروں کو توڑ دے گا جنہیں وہ جکڑی ہوئی ہے) وہ کون سے بوجھ تھے اور وہ کون سی زنجیریں تھیں جن میں انسانیت دبی اور جکڑی ہوئی تھی ان کی تفصیل تو طویل ہے لیکن اگر انہیں مختصراً دو لفظوں میں بیان کرنا مقصود ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ بوجھ اور وہ زنجیریں ارباب قوت و اقتدار کا استبداد تھا جس نے انسانیت کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ اس استبداد کی نوعیتیں مختلف تھیں لیکن قرآن نے انہیں تین بڑی بڑی شقوں میں تقسیم کر کے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ استبداد کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو وہ اصل کے اعتبار سے ان تین شقوں میں سے کسی ایک سے متعلق ہوگا۔ ان شقوں کو قرآن کریم نے "داستان بنی اسرائیل" میں یکجا بیان کیا ہے (۱) ملوکیت کا استبداد جس کا نمائندہ فرعون تھا۔ (۲) پیشوائیت کا استبداد، جس کی زنجیریں جسم ہی کو نہیں انسان کے قلب و دماغ کو بھی جکڑ دیتی ہیں اس کا ترجمان ہامان تھا۔ اور (۳) سرمایہ پرستی کا استبداد جو غیروں کو لونڈی بنا دیتا ہے اس کا مجسمہ قارون تھا۔ فرعون۔ ہامان۔ قارون یہ تین شخصیتیں نہیں بلکہ گروہ یا تین ذہنیں ہیں۔ تاریخ انسانیت پر غور کیجئے ہر جگہ یہی نظر آئے گا کہ ملوکیت۔ پیشوائیت۔ اور سرمایہ داری نے اپنے ناپاک گٹھ جوڑ سے انسانیت کا گلا گھونٹ رکھا ہے۔ ملوکیت انسان کی طبعی آزادی کو سلب کرتی ہے۔ پیشوائیت اس کی فکری صلاحیتوں کو مفلوج کرتی ہے اور سرمایہ داری اس کی اخلاقی جراتوں کو پامال کرتی ہے یہ تھیں وہ استبداد کی زنجیریں جنہیں نظام خداوندی نے جو حضورؐ کی وساطت سے ملا ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا اور یہی وہ کار ہائے عظیم تھا جو حضورؐ نے سر انجام دیا۔

ملوکیت کے استبداد کو ختم کرنے کے لئے قرآن نے یہ انقلاب آفریں پیغام حضورؐ کی وساطت سے نوع انسان کو دیا کہ

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳/۷۹) (کسی انسان کو یہ بات سزاوار نہیں کہ اللہ اسے (انسانوں کی ہدایت کے لئے) کتاب حکومت اور نبوت عطا فرمائے اور پھر وہ انسانوں سے کہے، خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ (یعنی خدا کے احکام کی جگہ میرے حکموں کی اطاعت کرنے لگو) اس پیغام سے یہ بات واضح کر دی گئی کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنا محکوم بنائے اس اصولی اعلان عظیم کی رو سے جہاں ایک انسان بادشاہ یا ڈکٹیٹر کا حق حکومت ختم ہو جاتا ہے وہاں انسانوں کی جماعت، جمہوری نظام کی اکثریت کا حق حکومت بھی باقی نہیں رہتا۔ مندرجہ بالا آیت میں "من دون اللہ" کی استثناء اس حقیقت پر شاہد ہے کہ حکومت کا حق انسانوں کو نہیں بلکہ صرف خدا کو حاصل ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اسی آیت کے باقی حصے سے اس کی وضاحت بھی بخوبی ہو جاتی ہے کہ "خدا کی حکومت" اس کتاب کی رو سے قائم ہوتی ہے جسے وہ بطور اپنے ضابطہ حکومت کے لوگوں کی طرف نازل کرتا ہے۔ اس حقیقت کو ایک دوسرے مقام پر یہ کہہ کر واضح کر دیا ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴) (جو شخص اس (کتاب) کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتا جسے اللہ نے نازل کیا ہے تو یہی لوگ کافر ہیں۔

پیشوائیت کے استبداد کا خاتمہ اس نے یہ کہہ کر کر دیا کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی حاجب درمیان نہیں۔

کوئی وسیلہ اور واسطہ نہیں۔ اطاعت خدا کے اس قانون کی ہوگی جو اس نے اپنے رسول کی وساطت سے نوع انسانی کو دیا اور یہ اطاعت ہوگی اس نظام کی وساطت سے جو اس قانون کو عملاً نافذ کرنے کے لئے وجود میں آئے۔ اس نے صرف پیشوائیت ہی کو ختم نہیں کیا بلکہ خود سلسلۂ نبوت کو بھی یہ کہہ کر ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا کہ نوع انسانی کی راہ نمائی کے لئے جن قدر اصولی تعلیم کی ضرورت تھی اسے مکمل شکل میں دے کر قرآن کی دفتین میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اب انسان ان اصولوں کی روشنی میں زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا حل اپنے علم و بصیرت کی رو سے خود تلاش کرے "!

سرمایہ پرستی کا خاتمہ اس نے اس اعلان سے کر دیا "لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۵۳/۳۹) (ما حاصل بہ مقدار محنت) کائنات کا قانون ہے اس لئے یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص محنت نہ کرے اور اس کی ذمہ داریوں کا بوجھ دوسرے لوگ اٹھائیں۔ سورۂ بقرہ میں ہے کہ (یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۲/۲۱۹) یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ نظام ربوبیت میں کس قدر حصہ مفاد عامہ کے لئے کھلا رکھنا ہوگا اس کے جواب میں کہا گیا ہے جو کچھ تمہاری اپنی ضرورت (پرورش) سے زیادہ ہے وہ سب کا سب مفاد عامہ کے لئے کھلا رکھو (قُلِ الْعَفْوَ ۲/۲۱۹) اگر تم وسعت اور کشادگی چاہتے ہو تو اس کا طریق یہ ہے کہ اپنی محنتوں کا عزیز ترین ماحصل ربوبیت عامہ کے لئے کھلا رکھو۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (۳/۹۲)۔ اس نے اعلان کیا کہ وسائل پیداوار خدا کی بخشش ہیں۔ جن کا مقصد تمام نوع انسانی کی ربوبیت ہے اس لئے کسی کو زیبا نہیں کہ ان کی حد بندی کر کے انہیں اپنی ملکیت میں لے لے (وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۱۷/۲۰) اور جو کچھ تیرے رب کی طرف سے بطور بخشش عطا ہوا ہے اسے روکا نہیں جا سکتا۔

دولت کے انبار جمع کرنے اور سرمایہ پرستانہ روش کا انجام وہ یہ بتاتا ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَیَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ...... فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (اے ایمان والو! اس حقیقت سے آگاہ رہو کہ پیر اور مولوی لوگوں کا مال محض تخریبی نتائج کے لئے (مفت) کھا جاتے ہیں اور اس طرح اس مال کو) ربوبیت عامہ میں صرف کرنے سے روکتے ہیں۔ یاد رکھو! جو لوگ سونے اور چاندی کے ڈھیر جمع کرتے ہیں اور انہیں نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے صرف نہیں کرتے تو انہیں الم انگیز سزا سے آگاہ کر دو۔ (یہ سزا اس دور میں سامنے آئیگی) جب اس مال کو جہنم کی آگ میں گرم کیا جائے گا اور پھر اس کے ساتھ ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پشت کو داغ دیا جائے گا۔ اور ان سے کہا جائے گا) کہ یہ ہے وہ مال جو تم نے (نوع انسانی کی ربوبیت کے لئے کھلا رکھنے کے بجائے) اپنے ذاتی مفاد کے لئے جمع کر رکھا تھا سو آج اس کا مزہ چکھو۔

قرآن کے ان بسیط حقائق اور فطری قوانین کو ٹھیک جیتے جاگتے عملی نظام کی شکل میں سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے قائم کیا۔ حضورؐ نے (کتاب اللہ) کے مطابق عملی معاشرہ (نظام مملکت یا حکومت) قائم کر کے دکھا دیا کہ خدا کے قوانین ناممکن العمل نہیں اور یہی تھا وہ کارِ نمایاں جو حضورؐ نے انجام دیا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں رسول اللہؐ کی سیرت طیبہ آنے والے انسانوں کے لئے "اسوہ حسنہ" بنتی ہے۔

زمانہ کی آنکھیں ابھر ابھر کر دیکھ رہی ہیں کہ وہ خوش بخت قوم کون سی ہے جس کے ہاتھوں حضور نبی اکرم کا لایا ہوا انقلاب دوبارہ ظہور میں آئے گا اور دنیا میں خدا کا نظام ربوبیت عملاً قائم ہو جائے گا۔ یہی وہ قوم ہوگی جس کے حصے میں تمام نوع انسان کی امامت آئے گی اور جو عالمگیر انسانیت کو اس جنت کی طرف لے جائے گی جس کے لئے جنت سے نکلا ہوا آدم اس قدر مضطرب اور پریشان ہے۔ طلوع اسلام اسی قرآنی نظام کا داعی ہے۔ اس کا ایمان ہے کہ آخر الامر کامیابی قرآنی نظام ہی کو ہوگی کیونکہ یہی نظام انسانی شرف و تکریم کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اسی کا نام سنت رسول اللہ کا اتباع ہے۔ یعنی قرآنی معاشرہ کا قیام، خدا کا حکم اور سنت رسول اللہ ہے اور یہی طلوع اسلام کی دعوت ہے۔

دیگر مصنفین و ناشرین کی کتابیں

ابوبکر صدیق اکبرؓ

مصر کے نامور مؤرخ محمد حسین ہیکل کی تصنیف۔ جس کا اردو ترجمہ محمد احمد صاحب پانی پتی نے کیا ہے۔ جناب صدیق اکبرؓ کی حیات طیبہ اور خلافت راشدہ کی سب سے پہلی کڑی کا بصیرت افروز تفصیلی تذکرہ۔ قیمت مجلد ۷ روپے۔

عمر فاروقؓ

یہ بھی مصری مؤرخ جناب ہیکل کی معرکہ آرا تصنیف ہے جس کا ترجمہ حبیب اشعر صاحب نے نہایت شگفتہ انداز میں کیا ہے۔ ضخیم اور مفصل کتاب ہے۔ جس میں حضرت فاروق اعظمؓ کی سیرت اور خلافت کا واضح نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ قیمت مجلد ۲۰ روپے۔

حیات محمدؐ

مصر کے نامور مؤرخ جناب ہیکل کی شہرہ آفاق تصنیف کا اردو ترجمہ۔ ضخیم اور مفصل کتاب ہے
قیمت مجلد ۲۲ روپے ۵۰ پیسے۔

یہ کتابیں بھی ادارہ طلوع اسلام سے مل سکتی ہیں۔

نقد و نظر

۱۔ ماہنامہ فکر و نظر

سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ (مرکزی ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی) حکومت کی طرف سے قائم کردہ وہ ادارہ ہے جس کا بنیادی مقصد، اسلامی ایڈوائزری کونسل (اسلامی مجلسِ مشاورت) کو ان مسائل کے حل کرنے کے لئے ضروری مواد مہیا کرنا ہے۔ جن کے متعلق اس مجلس سے دریافت کیا جائے کہ اسلام کا ان کی بابت کیا حکم ہے۔ زیرِ تبصرہ ماہنامہ اسی ادارہ کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے اب تک سات نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے جنوری۔ فروری سنہ ۱۹۶۴ء کا شمارہ ہے۔ جو شمارے اس وقت تک شائع ہو چکے ہیں ان میں ادارہ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کا ایک سلسلۂ مضامین "سنت اور حدیث" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ (تحقیقاتِ زکوٰۃ کے متعلق بھی ان کا ایک مبسوط مقالہ شائع ہو چکا ہے جسے ہم نے طلوعِ اسلام کی فروری سنہ ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں شائع کیا تھا) ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ حدیث کے بارے میں ان کا مسلک کٹر سے کٹر منکرینِ حدیث سے بھی دو قدم آگے ہے لیکن ان کا انداز یہ ہے کہ منکرینِ حدیث کو تین صلواتیں پہلے اور تین صلواتیں بعد میں سنا کر درمیان میں وہ سب کچھ کہہ جائینگے جو منکرینِ حدیث کہتے ہیں۔ بلکہ کچھ ان سے بھی زیادہ۔ پہلے یہ دیکھئے کہ احادیث کے متعلق ان کا نظریہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ہم نے پچھلے مقالات میں مختلف مثالوں سے یہ واضح کر دیا ہے کہ فقہی اور کلامی قسم کی احادیث میں سے اکثر و بیشتر اپنی موجودہ شکل میں تاریخی طور پر غیر صحیح ہیں..... (اور یہ ظاہر ہے کہ) اگر اجماع اور حدیث جیسے بنیادی اصولوں کے بارے میں احادیث تاریخی طور پر غیر صحیح ثابت ہو جائیں تو دوسری بیشتر قسم کی احادیث کی صحت یقیناً معرضِ خطر میں پڑ جاتی ہے ..... (احادیث کی) اسناد کی منفی حیثیت تو مسلم ہے لیکن اسے مثبت قطعی حجت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

پھر لکھتے ہیں۔

احادیث کا ایک نمایاں ترین پہلو ان کا باہمی تعارض ہے اور یہ خصوصیت کہ تقریباً ہر امر کے بارے میں یہ مختلف نقطہ ہائے نظر کی ترجمانی کرتی ہے۔

یعنی احادیث کی تاریخی حیثیت مشکوک ہے۔ ان کی اسناد کی مثبت حیثیت کچھ نہیں۔ انہیں قطعی حجت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ان میں باہمی تعارض اس قدر ہے کہ تقریباً ہر معاملہ میں ہر ایک کو اپنے اپنے نقطہ نظر کی تائید میں کوئی نہ کوئی حدیث مل جاتی ہے۔

اور آگے بڑھئے۔ فرماتے ہیں۔

درحقیقت بیشتر احادیث مجموعہ ہیں ان کہاوتوں جیسے مقولوں کا جن کی تراش خراش خود قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے ہاتھوں انجام پائی۔ مگر انہیں رسالتمآب کی طرف منسوب کر دیا گیا۔

جہاں تک فقہی احادیث کے امت کے لئے ضابطہ احکام بننے کا سوال ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:۔

فقہی احادیث میں ہمارے موجودہ مسائل کا بنا بنایا تیار حل موجود نہیں کہ بس اس کے نفاذ کی دیر ہو۔ یہ احادیث نئی جرح و تعدیل کی مقتضی ہیں۔

واضح تر الفاظ میں۔

اس حقیقت کی جس قدر تاکید کی جائے کم ہے کہ احادیث کے مختلف عناصر ترکیبی کی از سر نو جانچ پڑتال اور ان کے بدلے ہوئے معاشرتی اور اخلاقی ماحول کے پس منظر میں ان کی تعبیر نو ضروری ہے۔ یہ نئی جرح و تعدیل اور تعبیر و تشریح احادیث کے تاریخی تجزیے کے بغیر ناممکن ہے۔ یعنی ضرورت اس بات کی ہے کہ احادیث کو پھر سنت جاریہ کا مقام سمجھا جائے۔ اور ان میں جو حقیقی عناصر ہیں انہیں ان آمیزشوں سے الگ کر لیا جائے جو وقتی مصالح کا نتیجہ تھیں۔

آپ احادیث کے متعلق ڈاکٹر صاحب کے ان خیالات کو دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ جس چیز کو عام طور پر "انکارِ حدیث" کہا جاتا ہے کیا وہ اس سے زیادہ کچھ اور بھی ہے۔ لیکن اس "تشبیب" کے بعد آپ ڈاکٹر صاحب کی "گریز" ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں۔

اس سارے سلسلۂ مضامین میں ایک بات ہمارے قارئین نے ضرور نوٹ کی ہوگی۔ اور وہ یہ ہے کہ اگرچہ ہم مجموعی طور پر احادیث کی تاریخی حیثیت کو مشکوک جانتے ہیں لیکن ہم نے کہیں یہ نہیں کہا کہ یہ جھوٹی اور جعلی ہیں۔

پھر لکھتے ہیں۔

(فقہی اور کلامی) احادیث میں سے اکثر و بیشتر کی صحت اگرچہ مشکوک ہے لیکن ایک بنیادی مفہوم میں ان کی بھی حجیت کا قائل ہونا پڑے گا۔

اس کے بعد روئے سخن " منکرینِ حدیث " کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ ان کے بارے میں ارشاد ہے۔

> یہ اصحاب ملتِ مسلمہ کی تعمیرِ نو کے لئے اسلام کی تخریب کے درپے ہیں۔ نہ صرف یہ اصحاب مآل اندیشی کی صفت سے یکسر معرّا ہیں بلکہ مسائل زیرِ بحث کی نسبت ان کے نقطۂ نظر میں ایک شدید قسم کا انجماد پایا جاتا ہے۔ اور خود احادیث کے ارتقا کے متعلق افسوسناک حد تک ان کی لاعلمی نظر نواز ہے۔ احادیث کے بارے میں نہ تو یہ علم رکھتے ہیں نہ بصیرت۔

آپ نے اس "حصار" کو دیکھ لیا جس کے اندر بیٹھ کر ڈاکٹر صاحب، حدیث کے متعلق اپنا مسلک بیان فرماتے ہیں اور (بزعمِ خویش) سمجھتے ہیں کہ وہ ہر قسم کے خطرات سے محفوظ ہیں۔

اب ایک اور قدم آگے بڑھیئے۔ ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ ان طویل مقالات میں لکھا ہے اس کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ احادیث درحقیقت سنتِ نبویؐ پر متفرع ہیں۔ اور یہی چیز ان کی اہمیت کو ثابت کرتی ہے۔ لیکن خود سنت کیا ہے، اس کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے ایک نئی اصطلاح وضع کی ہے یعنی "سنتِ جاریہ"۔ "سنت جاریہ" کیا ہے اس کی وضاحت ڈاکٹر صاحب ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

> ہم نے بار بار یہ حقیقت دہرائی ہے کہ ... اگرچہ حدیث کی بنیاد آخر کار سنتِ نبویؐ پر ہے لیکن فی الواقع وہ مظہر ہیں سلفِ صالحین کی اس سنت کی جو رسول اللہ کی سنت کے سانچے میں ڈھلی تھی۔ درحقیقت بیشتر احادیث مجموعہ ہیں ان کہاوتوں جیسے مقولوں کا جن کی تراش خراش خود قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے ہاتھوں انجام پائی مگر انہیں رسالتمآبؐ کی طرف منسوب کر دیا گیا۔ یہ نسبت سراسر بے بنیاد تھی۔ اگرچہ ان مقولوں میں کہاوتوں کا اسلوب پایا جانا خود اس بات کی شہادت ہے کہ یہ نسبت "تاریخی صحت" سے محروم ہے۔ الغرض یہ احادیث ایک وسیع الذیل اور عظیم المرتبت شرح ہیں سیرتِ نبویؐ کی جس کے شارح ہیں قرونِ اولیٰ کے مسلمان۔ چنانچہ سنتِ نبویؐ پر مبنی ہونے کے ساتھ ہی ساتھ یہ سلف صالحین کے بصائر و حکم کا مجموعہ ہیں۔

اس کی مزید تشریح ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں۔

> احادیث بالعموم "تاریخی صحت" سے محروم ہوتے ہوئے بھی سنّتِ نبویؐ سے جدا ہرگز نہیں۔ حدیث اور سنّت کے درمیان ایک گہرا اور ناقابلِ شکست رشتہ ہے۔ ہم اس سلسلۂ مضامین کی پہلی قسط میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ طبقۂ اول اور دوم کے فقیہوں اور مفتیوں نے اور اربابِ سیاست

اور اولوالامر نے امتِ مسلمہ کے مصالح کو مدِنظر رکھتے ہوئے سنتِ نبویؐ کی تعبیر و توسیع کی تھی۔ اس طرح ہر طبقے کی یہ تعبیر و توسیع اس زمانے کی سنتِ جاریہ تھی۔ اس سنتِ جاریہ نے جب الفاظ کا جامہ پہنا تو حدیث کی شکل میں نمودار ہوئی۔ یوں سنتِ نبویؐ حدیث میں بھی اسی طرح جاری و ساری ہے۔ جس طرح وہ سنتِ جاریہ پر بھی حاوی تھی۔ لیکن ذاتی اجتہاد اور علاقائی اجماع کے مسلسل عمل کی وجہ سے یہ سنتِ جاریہ صرف۔ سنتِ نبویؐ پر مشتمل نہ تھی بلکہ اس میں سنتِ نبویؐ کی علاقائی مجتمع علیہ تعبیر کا عنصر بھی شامل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مدینہ۔ کوفہ عراق وغیرہ کی اپنی الگ الگ سنتِ جاریہ تھی۔ بالکل یہی صورت حدیثوں کی بھی ہے کہ ان میں علاقائی بنیادوں پر اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ایسا ہونا ناگزیر بھی تھا۔ کیونکہ احادیث، سنتِ جاریہ کی مظہر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ احادیث کا ایک نمایاں ترین پہلو ان کا باہمی تضاد ہے۔ اور یہ خصوصیت کہ تقریباً ہر امر کے بارے میں یہ مختلف نقطہ ہائے نظر کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اس حقیقت سے جہاں احادیث کی تاریخی صحت مشکوک ہو جاتی ہے۔ وہاں ان کا یہ وصف بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ حدیثیں مختلف نقطہ ہائے نظر کی ترجمان ہونے کی وجہ سے امتِ مسلمہ کے سوادِ اعظم یعنی اہل سنت والجماعۃ کے باہم ہونے اور رواداری اختیار کرنے کا سب سے بڑا سبب بن گئیں۔ احادیث کے ذریعہ اہل السنت نے درمیان کی راہ اختیار کرنے اور اعتدال پسندانہ امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی اور ان کی کوششیں بڑی حد تک مشکور ہوئیں۔ لیکن طبقہ متقدمین کی سنتِ جاریہ اور احادیث کی تشکیل میں فرق تھا۔ موضوعِ زیرِ بحث کے پیشِ نظر سب سے اہم فرق یہ تھا کہ جہاں سنتِ جاریہ ایک زندہ اور ترقی پذیر عمل تھی وہاں حدیث ایک رسمی شے بن گئی جس کے ذریعہ اسلام کی تقریباً پہلی تین صدیوں کی سنتِ جاریہ کے آمیزہ (مرکب شکل) کو ابدیت مطلقہ بخشنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تقاضائے وقت یہی تھا۔ کیونکہ ترقی پذیر عمل کی تشکیل لازمی ہے۔ مگر اسے کوئی رسمی شکل نہ دی جائے تو خود اس عمل کے ٹوٹنے کا خطرہ رہتا ہے۔ کیونکہ تشکیل کے بغیر اس کی انفرادیت باقی نہیں رہتی۔ لیکن احادیث کی تدوین کا نتیجہ بالآخر محض تشکیل و تنظیم کی صورت میں نہیں بلکہ مکمل انجماد کی شکل میں نمودار ہوا۔ بلاشک و شبہ امتِ مسلمہ کی موجودہ مشکلوں کا تقاضا یہ ہے کہ اس انجماد میں پھر سے حرکت پیدا کی جائے۔ سنتِ جاریہ کی روانی میں احادیث کے سدِ عظیم نے جہاں رکاوٹ پیدا کر دیا تھا وہاں سے "بوئے نساد" کو دور کر دیا جائے۔

ہم قارئین سے اس قدر طویل اقتباس کے لئے معذرت خواہ ہیں لیکن اس کے بغیر بات سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔ ہمارا خیال ہے کہ آپ نے اب اندازہ کر لیا ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب کہنا تو وہی کچھ چاہتے ہیں جو (بقول ان کے) ترقی پسندوں کا مسلک ہے لیکن اس انداز سے کہ ـــــ منہ موڑ کر اُدھر کو، اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ ـــ چنانچہ اتنا کچھ کہنے کے بعد، انہیں پھر یاد آتا ہے کہ مصلحت کا تقاضا ہے کہ اس مقام پر "ترقی پسندوں" کو ایک ملاحی سنادی جائے۔ چنانچہ وہ اقتباس بالا کے بعد لکھتے ہیں۔

لیکن یہیں آکر "ترقی پسند" گروہ رکاوٹ ڈالتا ہے۔ وہ یہ کہنے لگتا ہے کہ "حدیث، سنت، یہ سب رجعت پسندی کے حربے ہیں۔ ان کی اصلاح ناممکن ہے۔ اگر آگے بڑھنا ہے تو انہیں پس پشت ڈال دو"

اس جملہ معترضہ سے قطع نظر، ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ کہا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ۔

(۱) جو کچھ ہمارے ہاں گزشتہ ایک ہزار سال سے سنتِ نبویؐ کے نام سے ہوتا چلا آرہا ہے وہ خالصۃً سنتِ نبویؐ نہیں بلکہ پہلی تین صدیوں کے مسلمانوں کا عمل ہے۔ اسے سنتِ جاریہ کہتے ہیں۔

(۲) مسلمانوں کے اس عمل کو جب ضبطِ تحریر میں لایا گیا تو اس ریکارڈ کا نام حدیث رکھا گیا۔

(۳) سنتِ جاریہ کو جاری رہنا چاہیئے تھا۔ لیکن اس تحریری ریکارڈ (مجموعہ احادیث) کے متعلق یہ عقیدہ پیدا کر لیا گیا کہ یہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنتِ جاریہ بھی منجمد ہو کر رہ گئی۔

(۴) اب ضرورت ہے کہ اس منجمد شدہ سنتِ جاریہ کو پھر سے متحرک کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے اس عقیدہ کو بدلنا ہوگا کہ

(i) احادیث یقینی طور پر رسول اللہؐ کے اقوال و افعال اور تقریر کا مجموعہ ہیں۔

(ii) یا یہ کہ احادیث وحی خفی کا نام ہے اور

(iii) جو کچھ احادیث میں درج ہے وہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہے گا۔

احادیث کی پوزیشن یہ رہ جائے گی کہ وہ پہلی تین صدیوں کے مسلمانوں کے عمل کی تاریخ ہے اور ہم اس کے مجاز ہیں کہ اس عمل میں اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مناسب رد و بدل کر لیں۔ اس طرح ہمارا عمل سنتِ جاریہ بن جائے گا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے مقالہ میں "ترقی پسندوں" کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اس سے ان کی مراد کون لوگ ہیں۔ لیکن چونکہ ہم بھی حدیث کے متعلق ایک خاص نقطۂ نگاہ رکھتے ہیں اس لئے ہم اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ حدیث کی پوزیشن کے متعلق جو کچھ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے ہمارا اس سے اتفاق ہے۔ البتہ جس انداز سے

انہوں نے بات کی ہے اس سلسلہ میں ہم ان کی خدمت میں اتنا مزید عرض کریں گے کہ اگر ان کی حیثیت ایک پرائیویٹ فرد کی ہوتی تو وہ جس طرح جی چاہے بات کرتے۔ لیکن اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ہونے کی جہت سے ان پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دین کے معاملہ میں جو بات کریں وہ صاف، واضح اور دو ٹوک ہو۔ ان کے منصب کا تقاضا ہے کہ وہ الجھے ہوئے مسائل کو سلجھائیں لیکن ان کا ـــــــ مثلِ بے بودن سرگردان مستانہ زیستن ـــ کا انداز تو ان مسائل کو اور بھی الجھا دے گا۔ سنت کے لئے "سنّتِ جاریہ" کی ایک جدید اصطلاح وضع کرنا اور پھر تین سو سال تک کے مسلمانوں کے عمل کو "سنّتِ جاریہ" قرار دے کر اسے ایک دینی حیثیت دے دینا اور اسی سنت کو پھر سے متحرک بنانے کی تجویز پیش کرنا، خواہ مخواہ الجھاؤ پیدا کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔ حدیث یا سنّت کے سوال نے ہمارے ہاں آج کل جو اہمیت اختیار کر رکھی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں سب سے بنیادی مسئلہ یہ درپیش ہے کہ مملکتِ پاکستان کے لئے اسلامی قوانین کس طرح مرتب کئے جائیں۔ اس مسئلہ کے حل کے لئے ضروری ہے کہ یہ متعین کیا جائے کہ جو کچھ ہمارے ہاں اسلام کی نسبت سے چلا آ رہا ہے اس میں کون کون سے عناصر غیر متبدل ہیں اور کون کون سے ایسے جن میں تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہمارے پاس اس سلسلہ میں حسبِ ذیل عناصر ہیں۔

(۱) قرآن کریم، جس میں بعض امور کے متعلق تفصیلی احکام ہیں اور بیشتر امور کے متعلق اصول اور حدود دے گئے ہیں۔

(۲) احادیث کے مجموعے جن میں نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کے متعلق تفاصیل بھی ہیں اور فقہی احکام بھی۔

(۳) فقہ ـــ چونکہ پاکستان میں اکثریت فقہ حنفی کی پابند ہے اس لئے اس سلسلہ میں اصولاً اسی فقہ کے متعلق گفتگو ہو گی۔

سوال یہ ہے کہ پاکستان میں قانون سازی کے سلسلے میں ان میں سے کون کون سے عنصر کو غیر متبدل رکھا جائے گا۔ اس سلسلہ میں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ان قوانین کا مسلمانوں کے تمام فرقوں پر یکساں طور پر اطلاق ہو گا۔ ہم ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب سے گزارش کریں گے کہ وہ اس سوال کا جواب صاف اور واضح الفاظ میں سامنے لائیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس ضمن میں ان کا نقطۂ نگاہ کیا ہے۔ (جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں) یہ اس لئے ضروری ہے کہ اسلامی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ہونے کی حیثیت سے، ان پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور اس ذمہ داری کا تقاضا ہے کہ ایسے اہم اور بنیادی مسئلہ کے متعلق ان کا نقطۂ نگاہ واضح طور پر سامنے آ جائے کیونکہ قانون سازی کے سلسلہ میں اس کا اثر بڑا گہرا پڑے گا۔ ہمیں امید ہے کہ محترم ڈاکٹر صاحب جرأت سے کام لے کر کھلے کھلے انداز سے بات کریں گے اور اپنے مافی الضمیر کو پیچیدہ الفاظ کے گورکھ دھندے میں الجھانے کی

کوشش نہیں کرینگے۔ نہ ہی اس قسم کے سطحی پراپیگنڈے سے، حقائق کو عوام کے مشتعل کردہ جذبات کے دھوئیں میں چھپانے کی ــــــ کہ

حدیث کی مخالفت میں ان دنوں جو تحریک چل رہی ہے ہم اس کے سراسر مخالف ہیں۔ کیونکہ اگر ہم نے تمام احادیث سے انکار کر دیا تو رسول اللہ سے لے کر آج تک کے ساڑھے تیرہ سو سال کے زمانی بُعد کی یہ وسیع خلیج کیوں کر عبور ہوگی۔ احادیث کے بغیر جو بھیانک خلا پیدا ہو جاتا ہے اس میں قرآن کریم بھی ہمارے ہاتھوں سے ضائع ہو جاتا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ کا اپنا فعل ہی ہے جو خدا کے قول کے معانی کو متعین کرتا ہے۔ احادیث کے بغیر جس کا جو جی میں آئے قرآن کو معنی پہنا سکتا ہے۔ احادیث کے انکار سے خود قرآن کا وجود اور اس کی صحت۔ بلکہ خود رسول اللہ کا اپنا وجود ایک داستان بن کر رہ جاتا ہے۔

یہ پراپیگنڈہ یہاں سیاسی مفاد پرستوں نے شروع کیا تھا۔ اگر ایسے ذمہ دارانہ منصب پر فائز شخص بھی اسی سطح پر اُتر آئے تو اس سے یقیناً افسوس ہوتا ہے۔ تمام حدیثوں کا انکار تو فرقہ اہل قرآن والے بھی نہیں کرتے۔ اور وہ بھی اس انداز کا انکار کہ جس سے (معاذ اللہ) خود قرآن کا وجود اور اس کی صحت بلکہ خود رسول اللہ کا اپنا وجود (گرامی) بھی ایک داستان بن کر رہ جائے۔ اور پھر تعجب بالائے تعجب کہ یہ الزام وہ شخص دھر رہا ہے جو خود احادیث کی تاریخی صحت۔ حجیت اور ابدیت کا منکر ہے۔

بہرحال ہم نے قانون سازی کے سلسلے میں غیر متبدل اور تغیر پذیر عناصر کا جو سوال پیش کیا ہے امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف اس کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرما کر بات صاف کر دینگے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں، یہ سوال اب محض نظری بحث کا موضوع نہیں رہا۔ اس کا براہ راست تعلق پاکستان کے سب سے اہم اور بنیادی مسئلے سے ہے۔ پاکستان میں اسلامی قوانین کا نفاذ ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ ان قوانین کے مرتب کرنے کا اصول کیا ہوگا؟ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ اسلام میں تمام قوانین پہلے سے مرتب شدہ ہیں۔ اسلامی مملکت کا فریضہ صرف ان قوانین کو نافذ کرنا ہے۔ اس کے برعکس دوسرا گروہ ہے جو دوسرے کنارے پر پہنچ چکا ہے اور کہتا ہے کہ ہمیں ہر قانون نئے سرے سے مرتب کرنا چاہیئے۔ ان کے درمیان وہ گروہ ہے جو کہتا ہے کہ بعض قوانین ایسے ہیں جنہیں من وعن نافذ کرنا ہوگا اور بعض ایسے جنہیں ہم خود مرتب کر سکتے ہیں۔ اس گروہ میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو کہتے ہیں کہ احادیث میں جو کچھ آ چکا ہے وہ بھی ناقابل تغیر و تبدل ہے۔ بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ان میں بھی تغیر و تبدل ہو سکتا ہے۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ محترم ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کا اس باب میں کیا مسلک ہے۔ اور پوچھنا اس لئے چاہتے ہیں کہ ان کی حیثیت انفرادی نہیں وہ ایک ایسے ادارہ کے سربراہ ہیں جس کا وجود ہی اس سوال کے حل کرنے کے لئے عمل میں لایا گیا ہے۔

۲- انڈونیشیا

مسلمانوں کے جن ممالک کو حال ہی میں آزادی ملی ہے ان میں انڈونیشیا کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ قریب ساڑھے سات لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی مملکت جس کی آبادی آٹھ کروڑ کے قریب ہے اور اس میں سے ۹۰ فیصد مسلمان ہیں۔ جغرافیائی لحاظ سے بھی اس کی پوزیشن بڑی اہم ہے اور یہ ملک ہمارا قریبی ہمسایہ بھی ہے۔ لیکن اس قرب اور اہمیت کے باوجود ہمارے ہاں اس مملکت کے متعلق قابلِ اعتماد معلومات بہت کم۔ بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ محترم مسٹر شاہ حسین رزاقی (ایم اے عثمانیہ) قابلِ مبارکباد ہیں کہ انہوں نے بڑی محنت اور تلاش سے ان معلومات کو فراہم کیا اور زیرِ نظر کتاب میں انہیں عمدہ سلیقہ سے پیش کیا ہے۔ اس میں انڈونیشیا کا تاریخی اور جغرافیائی پس منظر۔ حصولِ آزادی کے لئے ان کی کشمکش۔ آزادی کے بعد وہاں کی سیاسی پارٹیوں کی باہمی آویزش موجودہ احوال و کوائف اور مستقبل کے امکانات کے متعلق سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ہم میں سے اکثر کو یہ تو معلوم ہوگا کہ انڈونیشیا کا دارالسلطنت جکارتہ بڑا ترقی یافتہ شہر اور سیاست۔ تجارت۔ علم و ثقافت کا مرکز ہے۔ لیکن کتنے ہیں جنہیں اس کا علم ہے کہ اسی انڈونیشیا میں۔

وحشی باشندے غاروں میں رہتے اور بالکل برہنہ پھرتے ہیں۔ یہ آدم خور ہیں اور انسانوں کا سر کاٹ لینے کا طریقہ ان میں عام ہے بلکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جس شخص کا سر کاٹ لیا جاتا ہے اس کی روح سر کاٹنے والے کی غلام بن جاتی ہے۔ ان کے ہاں مردوں اور عورتوں (دونوں) کو ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کا حق حاصل ہے۔ اور بچوں کی پرورش کا ذمہ دار باپ کی بجائے ماموں ہوتا ہے۔ جب قبیلے کا سردار مر جاتا ہے تو اس کے ساتھ دشمن قبیلہ کا ایک زندہ آدمی دفن کیا جاتا ہے۔

یہ پُر از معلومات اور دلچسپ کتاب جو قریب ساڑھے چار سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ نیوز پرنٹ پر طبع شدہ کی (مجلد) کی قیمت ساڑھے سات روپے اور سفید کاغذ پر طبع شدہ کی دس روپے ہے۔ کتاب ادارہ طلوع اسلام ۲۵-بی گلبرگ، لاہور سے بھی مل سکتی ہے۔

۳- سرسیدؒ اور اصلاح معاشرہ

شائع کردہ۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور

انیسویں صدی کے آغاز میں مغلیہ سلطنت زوال اور شکست کے آخری مرحلوں سے گزر رہی تھی اور جوں جوں دن گزرتے گئے اس برصغیر کی وسعتوں پر برطانوی سامراج کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ

آزادی کی شکست نے یہاں کے مسلمانوں کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا اور ان کے نظام معاشرہ کی تمام خصوصیات زیر و زبر ہو کر رہ گئیں۔ ان کی زندگی کا ہر گوشہ نئی صورت حال سے متاثر ہوا۔ رسوم و رواج، عقائد و نظریات اور اخلاق و کردار سب کچھ اس کی زد میں آیا۔ اور سات سو برس یہاں اپنا تسلط قائم رکھنے کے بعد وہ ذلت اور پستی کی انتہا تک پہنچ گئے۔ اس نازک مرحلہ پر سرسید علیہ الرحمتہ کی صاحب عزم شخصیت اپنی قوم کو ذلت اور شکست کے ان مراحل سے بچانے کے لئے آگے بڑھی۔ اور ان کی مساعی جمیلہ نے قوم کی ڈوبتی ہوئی کشتی کا رخ ساحل مراد کی طرف پھیر دیا۔ محترم شاہ حسین رزاقی کی زیر نظر کتاب سرسیدؒ کی اسی کامیاب سعی مسلسل کی تفصیل پیش کرتی ہے اور فاضل مصنف نے اس کتاب میں بڑی حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے نہ صرف اس نازک صورت حال کا تجزیہ کیا ہے بلکہ اس کے ہر گوشے میں اصلاح معاشرہ کی اس سعی بلیغ کو بھی تفصیلاً پیش کیا ہے جسے سرسیدؒ کام میں لائے۔

زیر نظر کتاب میں معاشرہ کی عام کیفیت پیش کرنے کے بعد معاشرتی اصلاح کا خاکہ، تعلیمی اصلاح و ترقی، دینی عقائد کی درستی، رسوم و رواج میں مفید ترامیم، تہذیب و تمدن میں موثر تبدیلیاں۔ غلامی کے انسداد، تعدد ازدواج طرز معاشرت میں شائستگی، مذہبی رواداری، ملی اتحاد، ہندوؤں اور انگریزوں سے خوشگوار تعلقات، عورتوں کی تعلیم اور حقوق کے تحفظ سے متعلق تمام معاشرتی گوشے بڑی وضاحت کے ساتھ سامنے آگئے ہیں۔

محترم رزاقی صاحب مسلمانوں کے معاشرتی زوال کا خاکہ پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

قومی زوال و ادبار کے اس نازک دور میں ہندوستانی مسلمانوں کو خوش قسمتی سے سرسید احمد خان جیسا عظیم مصلح اور رہنما مل گیا۔ جن کی کوششوں نے تباہی کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے مسلمانوں کو بچا لیا۔ سرسید کی اصلاحی سرگرمیوں نے ایک منظم تحریک کی شکل اختیار کر لی جو انتہائی ناموافق حالات کے باوجود اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئی اور ہندوستان کے مسلمان معاشرتی اصلاح اور قومی ترقی کے راستے پر گامزن ہو گئے۔ (ص۱۷)۔

پھر وہ بتاتے ہیں کہ سرسیدؒ نے قوم کی حالت زار کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور وہ جانتے تھے کہ زندگی کے ہر شعبے میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں ان کا علاج کیا ہے؛ چنانچہ اس سلسلے میں انہوں نے سرسید کی زبانی اس دور کے مسلمانوں کی زندگی کے چند پہلوؤں کو یوں پیش کیا ہے۔

اگر ہماری قوم میں صرف جہالت ہی ہوتی تو چنداں مشکل نہ تھی۔ مشکل تو یہ ہے کہ قوم کی قوم جہل مرکب میں مبتلا ہے .... اب مکاری اور ظاہرداری کا نام اخلاق رہ گیا ہے۔ اور بے ایمانی اور دغابازی کا نام ہوشیاری۔ گفتگو پر خیال کرو تو عجیب حالت دکھائی دیتی ہے۔ ہزاروں اکثر مضامین زبان سے نکلتے ہیں۔ نہایت مہذب، معقول، ذی لقب اور نیک وضعدار آدمی بھی اپنی

گفتگو میں تہذیب و شائستگی کا مطلق خیال نہیں کرتے۔ اگر اشراف جوان دوستوں کی محفل میں جاؤ تو سنو کہ وہ آپس میں کیسی گالم گلوچ اور فحش باتیں ایک دوسرے کی نسبت کرتے ہیں۔ امیروں کا حال دیکھو تو ان کو دن رات بٹیر لڑانے، مرغ پالنے اور کبوتر اڑانے اور اسی طرح تمام لغویات میں اپنی زندگی بسر کرنے کے سوا اور کوئی کام دھندا نہیں۔ اور مذہبی طبقہ کا یہ حال کہ کینہ و نخوت اور اپنے تقدس و بزرگی اور خدا پرست ہونے کا گھمنڈ مقدس لوگوں میں کوٹ کوٹ کر بھرا پاؤ گے اور اگر دنیا میں شیطان کو ڈھونڈنے پھرو تو بجز مقدسین کے جبہ و دستار مبارک کے اور کہیں نہیں ملے گا۔ (صـ۱۶۱)۔

ہمارے ہاں اس وقت بھی ایسے بیسیوں عقائد و رسوم اسلام کا جزو بن چکی ہیں جن کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ ان کی تفصیل پیش کرتے ہوئے فاضل مصنف لکھتے ہیں۔

ہندوستان کے مسلمان دوسری قوموں کے اصول و عقائد، رسوم و رواج اور توہمات سے متاثر ہوئے تھے اور ان کی زندگی میں غیر اسلامی اثرات اس حد تک سرایت کر گئے تھے کہ اس ملک میں اسلام کو خود مسلمانوں کے طرز عمل سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اور مسلم معاشرہ کی فلاح و بہبود اور ترقی و اصلاح کے لئے عقائد و نظریات کو درست کرنا نہایت ضروری تھا۔ سرسید کو اس بات کا رنج تھا کہ مسلمان غیر اسلامی چیزوں کو اسلامی تصور کر کے ان پر عمل کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ایک طرف تو ان کی دینی و معاشری حالت بگڑ گئی اور دوسری طرف اسلام کی بدنامی ہوتی ہے کیونکہ لوگ مسلمانوں کی حالت دیکھ کر اسلام کا اندازہ کرتے ہیں اور مسلمانوں کی زبوں حالی کو اسلامی تعلیمات کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اس خیال کو دور کرنے اور مسلمانوں کی معاشری حالت کو بہتر بنانے کے لئے سرسید نے مسلمانوں کی دینی اصلاح کو لازمی قرار دیا اور ان کے عقائد درست کرنے کی جد و جہد شروع کر دی۔ (صـ۳۳)

فاضل مصنف نے آئندہ صفحات میں خواتین کی مظلومی، تعدد ازدواج، رسم غلامی اور فرقہ بندی کے خلاف بھی سرسیدؒ کے عقائد و نظریات اور عملی کوششوں کا تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ اور انہوں نے واضح کیا ہے کہ قدامت پسندی کی ان رسوم کو جزو دین قرار دینا خود دین خداوندی کی عطا کردہ آزادی و حریت کے سراسر منافی ہے۔

الغرض رزاقی صاحب نے اپنی اس پیشکش سے اس عظیم داعیٔ انقلاب کی اصلاحی کوششوں کا شایان شان تعارف کرایا ہے جو ہماری نشاۃ ثانیہ کے نئے دور کا علمبردار تھا۔

ڈھائی سو صفحات کی اس کتاب کو نیوز پرنٹ پر شائع کیا گیا ہے۔ کتابت و طباعت عمدہ ہے اور قیمت ۴ روپے ۵۰ پیسے۔ یہ کتاب بھی ادارہ طلوع اسلام ۲۵ - بی۔ گلبرگ۔ لاہور سے مل سکتی ہے۔

پٹسن کی مصنوعات تیار کرنے والوں میں
★ ایک ممتاز اور نمایاں مقام کے حامل ★

لطیف باوانی جوٹ ملز لمیٹڈ
ڈھاکہ

اِس ادارہ کے تیار کردہ تھیلے۔ بوریاں۔ سوتلیاں اور ٹاٹ کی دیگر اشیاء وکینواس دُنیا کے مختلف گوشوں میں بھیجے جاتے ہیں اور دُنیا کے ہر حصے میں ویسے ہی مقبول عام ہیں جیسے اپنے گھر میں۔

مینیجنگ ایجنٹس

احمد برادرز لمیٹڈ ۳۵-۳۶ جناح ایونیو۔ رمنا۔ ڈھاکہ

تار کا پتہ:- "باوانی" ـــ فون نمبر ۲ ـــ ۶۷۳۱

کراچی آفس ـــ بینک ہاؤس جلیب اسکوائر بندر روڈ
کراچی

رابطۂ باہمی

طلوعِ اسلام کنونشن

گزشتہ کئی سال سے اپریل کا مہینہ طلوعِ اسلام کنونشن کے لئے مختص سا چلا آ رہا تھا۔ لیکن اس دفعہ ادارہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کنونشن اپریل کے بجائے آئندہ اکتوبر میں ہو گی۔ یہ فیصلہ کالجوں کے طلباء اور پروفیسر صاحبان کے اس اصرار پر کرنا پڑا کہ وہ سالانہ امتحانات کے باعث اپریل میں بے حد مصروف ہوتے ہیں۔ اور حسبِ ضرورت کنونشن سے استفادہ کرنے کے لئے انہیں فراغت حاصل نہیں ہوتی۔ یہ طلباء ہمارے قومی مستقبل کے ابھرتے ہوئے روشن ستارے اور محترم پرویز صاحب کے "تسلیم بیٹوں" کی حیثیت رکھتے ہیں اور قرآن کی دعوت سے ان کا روز افزوں ذوق و شوق حق رکھتا ہے کہ کنونشن کے انعقاد میں ملت کے ان شاہین بچوں کی اس خواہش کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ بنابریں کنونشن آئندہ اکتوبر پر ملتوی کر دی گئی ہے۔ ادارہ امید کرتا ہے کہ بزم ہائے طلوعِ اسلام ادارہ کے اس فیصلے کو پسند کریں گی۔

بزمہائے طلوعِ اسلام کی ماہانہ رپورٹیں

ڈھاکہ بزم کا ماہانہ حالیہ اجلاس محترم صابر علی صاحب کی قیام گاہ پر ہوا۔ تلاوتِ کلامِ پاک اور اس کے مفہوم کی وضاحت کے بعد سابقہ ماہانہ اجلاس کی روئیداد سنائی گئی۔ اور اس کے بعد بزم کی گزشتہ کارکردگی کا جائزہ لیا گیا۔ ڈھاکہ میں طلوعِ اسلام کی ایجنسی قائم ہو گئی ہے اور خریداروں میں اضافے کی مہم کامیابی سے جاری ہے۔ بزم کا ٹیپ ریکارڈر جو برائے مرمت کراچی بھیجا گیا تھا درست ہو کر واپس پہنچ گیا ہے۔ اور آئندہ اتوار سے اس کے ذریعہ درسِ قرآن کا سلسلہ حسبِ سابق کامیابی سے شروع ہو جائے گا۔ بزم کا

آئندہ اجلاس ۴ اپریل کو محترم نبی حسن صاحب کے دولت کدہ پر ہوگا۔

راولپنڈی

بزم کے سرگرم احباب کو پچھلے دنوں ناقابلِ تلافی صدموں سے دوچار ہونا پڑا۔ محترم اقبال صاحب کے برادرِ عزیز وفات پا گئے اور ان کے پس ماندگان کی کفالت کی ذمہ داری اب اقبال صاحب پر عائد ہوگئی ہے۔ شیخ عبداللطیف صاحب کے برادرِ بزرگ، جو قرآنی فکر سے متمسک رہتے تھے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ مرزا ظہور الحق صاحب کی ہمشیرہ طویل علالت کے بعد اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ یہ صدمات بڑے امتحان طلب تھے لیکن قرآنی انقلاب کے ان علمبرداروں نے انہیں قانونِ خداوندی کا تقاضا سمجھ کر عزم و ہمت سے گوارا کیا۔

(ادارہ ان احباب کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دلی تعزیت اور ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔)

مردان

بزم کے اجلاس باقاعدگی سے جاری ہیں۔ پرویز صاحب کا درسِ قرآن بذریعہ ٹیپ سنایا جا رہا ہے۔ شہر کے صاحبِ علم حضرات انہیں بڑے ذوق و شوق سے سننے آتے ہیں۔ اور ہر بار نئی روشنی حاصل کرتے ہیں۔ شام کے ۷ بجے قرآن کریم کا درس باقاعدگی سے ہوتا ہے۔

بوریوالہ

بزم کے ہفتہ وار اجتماعات باقاعدگی سے ہوتے ہیں۔ مفہوم القرآن کا تیرہواں پارہ درسِ قرآن کے سلسلے میں شروع کیا گیا ہے۔ اہلِ علم اصحاب میں لٹریچر کی تقسیم بھی کی جاتی ہے اور برائے مطالعہ دیگر مطبوعات بھی مہیا کی جاتی ہیں۔

ملتان

طویل جمود کے بعد، سراج المنیر اور دیگر احباب کی کوششوں سے، بزم ایک نئے ولولے سے سرگرمِ کار ہوئی ہے۔ ادارہ کی ہدایات کے مطابق قرآنی فکر کی اشاعت کے سلسلے میں منظم طور پر سعی و عمل کا آغاز ہوگیا ہے اور خدا کے فضل سے خوش آئند نتائج سامنے ہیں۔

لائلپور

بزم کی تجدید عمل میں آگئی ہے۔ رکنیت کا سلسلہ شروع ہے۔ خان محمد اکرم خاں بزم کے نئے نمائندہ مقرر ہوئے ہیں۔

اسلام آباد

پاکستان کے اس نئے اور زیرِ تعمیر دارالسلطنت میں شمعِ قرآنی کے پروانوں کے لئے جستجو کا سلسلہ جاری ہے۔ اس جستجو کے نتیجے میں چند احباب کے مل بیٹھنے کی صورت پیدا ہوگئی ہے۔ اسلام آباد میں قرآنی فکر کے شیدائی حسبِ ذیل ایڈریس پر رابطہ قائم کریں۔

(اکرام سرور کوارٹر نمبر 671/C.O.II سیکٹر 3-I/6-G اسلام آباد)

بچوں کا صفحہ

قرآن شریف کی تلاوت

ارشد خوشی خوشی گھر آیا۔ آج ان کے اسکول میں انسپکٹر صاحب معائنے کو آئے تھے اس لئے انہیں جلدی چھٹی مل گئی تھی۔ (جلدی چھٹی مل جائے تو بچے شور مچاتے گھروں کو آتے ہیں)۔ اس کے ابا نے پوچھا کہ انسپکٹر صاحب نے کیا کیا سوال کئے تھے اور بچوں نے کیا کیا جواب دئے۔ ارشد نے بہت سی باتیں بتائیں لیکن ایک بات پر بڑے تعجب کا اظہار کیا۔ اس نے کہا کہ ماسٹر صاحب نے ایک چھوٹے سے لڑکے کو انگریزی کی ایک نظم یاد کرا رکھی تھی جسے اس نے فرفر سنا دیا۔ انسپکٹر صاحب بہت خوش ہوئے لیکن اس کے بعد انھوں نے اس بچے سے پوچھا کہ اُسے اس نظم کا مطلب بھی آتا ہے۔ بچے نے کہا کہ اُسے صرف نظم کے الفاظ یاد کرائے گئے ہیں۔ اسے انگریزی نہیں آتی۔ اس لئے اُسے نظم کا مطلب معلوم نہیں۔ اس پر انسپکٹر صاحب ناراض سے ہو گئے اور انہوں نے ماسٹر صاحب کو اور

ہم سب کو سمجھایا کہ جن الفاظ کا تمہیں مطلب معلوم نہ ہو انہیں رٹنے اور فرفر دُھرا دینے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ نظم اسی زبان کی یاد کرانی چاہیئے جو زبان بچوں کو آتی ہو۔ اس نے یہ بات ایسی اچھی طرح سمجھائی کہ ہمارا بڑا جی خوش ہوا۔ ارشد کے ابّا نے کہا کہ بیٹا انسپکٹر صاحب نے واقعی بڑی اچھی بات بتائی ہے۔ جن الفاظ کا تم مطلب نہ سمجھو انہیں پڑھنے اور دہرانے سے فائدہ کیا ہو سکتا ہے؟

ارشد نے کہا کہ ابّا جان! یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے لیکن ہمیں اسکول میں قرآن شریف پڑھایا جاتا ہے تو اس کے ہمیں صرف لفظ یاد کرائے جاتے ہیں۔ عربی زبان ہمیں نہیں پڑھاتے۔ اس لئے ہمیں ان الفاظ کا مطلب بالکل معلوم نہیں ہوتا۔ وہی الفاظ ہم نماز میں دُھرا لیتے ہیں۔ پچھلے رمضان شریف میں حافظ صاحب نے مسجد میں قرآن شریف ختم کیا تھا۔ انہیں بھی عربی زبان نہیں آتی تھی۔ انہوں نے بھی قرآن شریف کے الفاظ یاد کر رکھے تھے۔ انہی الفاظ کو انہوں نے دُھرا دیا تھا۔ صبح کے وقت دادی اماں بہت سی سورتیں اور دعائیں پڑھتی ہیں۔ عربی تو ایک طرف، دادی اماں کو تو اردو بھی نہیں آتی۔ اس سے کیا فائدہ ہے؟ خود انسپکٹر صاحب نے ہم سے قرآن شریف کی بہت سی سورتیں سُنیں اور بڑی شاباش دی۔ انہیں معلوم تھا کہ ہمیں عربی زبان نہیں آتی۔ اس پر انہوں نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا! ارشد کے ابا نے کہا کہ بیٹا! تم ٹھیک کہتے ہو۔

جن الفاظ کا مطلب نہ آتا ہو انہیں دُہرانے سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا لیکن ہمارے ہاں یہ رسم چلی آتی ہے کہ قرآن شریف کو بغیر سمجھے پڑھتے رہتے ہیں حالانکہ قرآن شریف بھی ایک کتاب ہے۔ اس میں بہت اچھی اچھی باتیں لکھی ہوئی ہیں۔ لیکن جب ہم ایک بات کو سمجھیں ہی نہیں تو ہم اس سے فائدہ کیا اُٹھا سکتے ہیں! ہمارے ہاں قرآن شریف کو خالی پڑھ لینے کا نام تلاوت قرآن شریف ہے۔ حالانکہ تلاوت کے معنی ہیں کسی کے پیچھے پیچھے چلنا۔ کسی کی پیروی کرنا۔ قرآن شریف کی تلاوت کے معنی ہیں اس کے احکام کی پیروی کرنا۔ سو جب تک قرآن شریف کو نہ سمجھا جائے اس کے احکام کی پیروی کس طرح کی جا سکتی ہے؟ یاد رکھو بیٹا! قرآن شریف کو پڑھنا اس طرح چاہیئے کہ وہ سمجھ میں آ جائے۔ اور سمجھنا اس لئے چاہیئے تاکہ اس کے احکام کی پیروی کی جائے۔ اسے "تلاوت قرآن شریف" کہیں گے نہ کہ بلا سمجھے اس کے الفاظ دُہرا لینے کو۔

ارشد نے کہا ابّا جان! آپ نے آج بہت اچھی بات سمجھائی ہے۔

انہوں نے کہا کہ بیٹا! یہ سب باتیں ہمیں قرآن شریف کے درس سے معلوم ہوئی ہیں ورنہ اس سے پہلے ہم بھی قرآن شریف کو بلا سمجھے پڑھ لینے کو "تلاوت" کہا کرتے تھے۔ تم بھی میرے ساتھ درس میں چلا کرو۔ اس نے کہا بہت اچھا ابا جان! میں آپ کے ساتھ درس سننے ضرور جایا کروں گا۔ (بھائی جان)